ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

پہلی قسط

یہ ممبئی کے اس علاقے کا ذکر ہے جہاں بموں کے دھماکوں سے پھیلنے والی دہشت کی وجہ سے ویرانی کا راج تھا۔ خریداری کی غرض سے بازار میں آنے والے مردوزن سب ایک دم غائب ہوگئے تھے، یوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے یہاں کا راستہ بُھلا دیا ہو۔ پورے علاقے کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا، دکاندار منہ لٹکائے گاہکوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ ان بے چاروں نے اب دکان کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ گویا بھولے بھٹکے گاہک کے نظر آنے کی دیر تھی اور ان کے آواز دینے کی......! نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی۔

میں خود بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ میری کھیلوں کے سامان اور بچوں کے کھلونوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جو اٹھارہ ساؤتھ اسٹریٹ میں واقع تھی۔ سامنے پوسٹ آفس تھا۔ ہم دکاندار خود کو طفل تسلی دیتے کہ کاروبار میں ایسا ہوتا ہے، کبھی مندی تو کبھی تیزی مگر اب اسے کیا کہیے کہ مندی کی راتیں طویل ہونے لگی تھیں۔ اس روز میں نے صبح نو بجے اپنی دکان کھولی تو اچانک مجھے شنکر داس نظر آ گیا۔

وہ سیدھا میری دکان کی طرف آ رہا تھا۔ شنکر داس عرف داسو سے میری خاصی پرانی جان پہچان تھی۔ وہ میری دکان کے قریب ایک اسٹور کی سیڑھیوں پر بیٹھا کرتا تھا۔ وہ پرانے اور نایاب ٹکٹ خریدنے اور بیچنے کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے اس کام میں خاصی مہارت رکھتا تھا، ٹکٹ دیکھتے ہی فوراً اس کے بیش قیمت ہونے کا اندازہ کر لیتا تھا، پھر اپنی چرب زبانی سے وہ گاہک بھی پھانس لیتا۔ شاذ ہی ایسا ہوتا کہ کوئی راہگیر اس کے ٹکٹوں کی طرف ایک نظر ڈالے اور آگے چل دے۔ مجھے اکثر اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر رشک آنے لگتا چنانچہ داسو وہ شخص تھا جسے دیکھ کر میں بھی سنجیدگی سے اس کا یہ کاروبار اپنانے کا سوچنے لگا کیونکہ اپنا کاروبار ٹھپ ہونے لگا تھا مگر میں ایسا کرنے سے قاصر رہا۔ وجہ بموں کے دھماکے اور اس کے فوراً بعد داسو کا اچانک غائب ہو جانا تھا۔

وہ یوں غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ! پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ بے چارہ دھماکوں کی زد میں آ کر جاں بحق یا زخمی ہو کر اسپتال کے بیڈ پر جا پڑا ہوگا مگر چونکہ اخبارات میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی مفصل رپورٹ ناموں کے ساتھ متواتر چھپتی رہتی تھی اور شنکر داس عرف داسو کا نام ان بدنصیبوں کی فہرست میں کہیں نظر نہیں آیا تھا اس لیے مجھے اپنا یہ خیال رد کرنا پڑا تھا۔

اس کا کاروبار اپنانے کی دھن سر میں سمانے کے بعد مجھے اس کا چند دن تو بے چینی سے انتظار رہا مگر پھر رفتہ رفتہ میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا تاہم اس کے اچانک گم ہونے پر تکلیف دہ حیرت ضرور ہوتی تھی۔ مجھے داسو یاد آتا تو میرے ذہن میں یہ اشتباہ آمیز خیال ضرور ابھرتا تھا کہ کہیں اس کا دھماکوں سے کوئی تعلق تو نہ تھا؟ مگر پھر فوراً ہی میں سر جھٹک کر اس لغو خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیتا کیونکہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک مرنجاں مرنج اور شریف انسان تھا اور انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف......! یہی وہ خوبی ہوتی ہے جو رشتوں کی پہچان بن کر رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو شناسائی بخشتی ہے۔

اب جو میں نے اچانک داسو کو اپنی طرف آتے دیکھا تو یک گونہ مسرت کی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔

''ارے داسو تم......؟ آؤ، آؤ۔'' میں نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دوستانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔ ''یار! تم اچانک کدھر غائب ہو گئے تھے؟''

وہ مجھے پہلے سے زیادہ صحت مند اور ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا جبکہ وہ بالکل چھریرے جسم کا مالک تھا یکدم لاغر، جیسے کسی قحط زدہ ملک کا باشندہ ہو مگر اب اس کی صحت قابلِ رشک حد تک بہتر نظر آ رہی تھی۔

میری بات سن کر وہ مسکرایا اور بولا۔ ''ہاں یار! کسی کام کے سلسلے میں اچانک مجھے باہر جانا پڑ گیا تھا، کل ہی تو لوٹا ہوں۔''

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے اسٹول پیش کیا۔ وہ اس پر تھکے تھکے سے انداز سے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھام رکھا تھا جو اس نے اپنے قریب زمین پر ٹکا دیا۔

''کہاں گئے تھے اور کیوں......؟'' میں نے بہ یک وقت حیرانی سے سوال کیے۔ ان سوالوں کے دوران ہی میرے ذہن میں مسترد شدہ شبہات دوبارہ ابھر کر گردش کرنے لگے تھے۔

''ٹکٹ کی خرید و فروخت کے سلسلے میں گیا تھا یار!'' وہ مخصوص لہجے میں مسکرا کر بولا۔

''کتنے فروخت ہوئے اور کتنے خریدے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''دونوں ہی کام سمجھو برابر کے ہوئے۔'' اس نے عجیب اور اسرار بھرے لہجے میں کہا، ساتھ ہی اپنی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں بند کی۔ میں نے اسے ناشتے کی دعوت دی، اس نے انکار نہیں کیا۔

میں نے طارق بشیر حلوائی کی دکان سے ترکاری، چنے کا سالن اور پوریاں منگوالیں۔ ہم دونوں ناشتہ کرنے لگے۔

اس دوران میں سوچنے لگا کہ ٹکٹوں کے کاروبار کا تو مجھے بالکل تجربہ نہیں اور نہ ہی میں اس میں سوجھ بوجھ رکھتا ہوں، معلومات بھی صفر تھیں۔ اگر کوئی شخص مجھے نیا ٹکٹ میلا کچیلا کر کے دکھاتا تو میں اسے قدیم سمجھنے لگتا۔ اس کاروبار میں بڑے داؤ پیچ آزمانا پڑتے ہوں گے۔

داسو کے مل جانے کے بعد میرے اندر کی کچھ مایوسی چھٹی تو دوسری مایوسی نے آن لیا مگر پھر میں نے امید بھرے انداز میں سوچا کہ اب کیا غم، داسو آ گیا ہے، یہ کاروباری مخاصمت اور رقابت سے بالاتر ہو کر ضرور مجھے کاروبار کے بارے میں طاق و مشاق کر سکتا تھا۔

یہ سب سوچنے کے دوران اچانک مجھے اسکول کے زمانے کا اپنا ایک ہم جماعت عارف سعیدی یاد آ گیا۔ عارف سعیدی کا باپ بھارت کے شمال مشرقی حصے کی ایک ریاست جمال گڑھ کا نواب تھا۔ باپ نے بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے پڑھنے کے لیے ممبئی بھیج دیا تھا۔

عارف سعیدی یوں تو ایک رئیس زادہ تھا مگر اس میں روایتی رئیس زادوں والی نخوت ذرہ بھر بھی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اس نے فوراً میری دوستی قبول کر لی تھی۔

وہ ریاضی کے مضمون میں بہت تیز تھا اور میں انگلش میں بہت ہوشیار تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ ہماری دوستی کی اصل وجہ مشترکہ مفاد ہی تھا۔ وہ مجھے حساب سکھاتا اور میں اسے انگریزی!

اسکول کے بعد کالج لائف میں اسے ممبئی چھوڑنا پڑا اور وہ دوبارہ جمال گڑھ چلا گیا۔ اس کے یوں واپس لوٹنے کی وجہ اس کے باپ کی طبیعت کی ناسازی تھی، اس کا ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال ہو گیا تھا۔ اب عارف سعیدی کو ریاست کا انتظام سنبھالنا تھا۔

عارف کا خیال اس لیے میرے ذہن میں اچانک ابھرا تھا کہ اس زمانے میں وہ بھی پرانے ٹکٹ جمع کرنے کے خبط میں مبتلا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں داسو سے کچھ پرانے ٹکٹ خرید کر عارف سے ملنے کے لیے جاؤں تو وہ ضرور مجھ سے اچھی قیمت میں سارے ٹکٹ خرید لے گا اور کچھ نہیں تو میں حاصل شدہ رقم سے اپنی دکان کو سنبھالا ضرور دے سکتا تھا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد بھی داسو نے کوئی بات نہ کی تو میں نے اسے کریدا۔ ''داسو! تمہارے پاس کچھ نایاب اور پرانے ٹکٹ ہوں گے؟''

درحقیقت میں چاہتا تھا کہ ایسے ٹکٹ لے کر عارف سعیدی سے ملنے جمال گڑھ جاؤں جنہیں دیکھ کر وہ پھڑک اٹھے اور مہنگے داموں فوراً خرید لے۔

عام ٹکٹوں کی خریداری میرے لیے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتی تھی اور میں سرِ دست گھاٹے کا سودا کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ نایاب ٹکٹ دیکھتے ہی عارف سعیدی مجھے منہ مانگے دام ادا کر سکتا تھا۔

''ہاں...... ہاں! کیوں نہیں، میرے پاس ایسے نایاب ٹکٹوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔'' داسو نے میرے سوال پر اپنے بریف کیس کو ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔ اس کی تیز نظروں نے شاید کوئی گڑبڑ اگاہک تاڑ لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی نظروں سے وہ میری طرف دیکھ کر دوبارہ مخصوص دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''میں نے تو پہلے بھی کئی بار تمہیں یہی مشورہ دیا تھا اسلم میاں کہ اور نہیں تو اپنی دکان میں ہی ٹکٹوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع کر دو، اچھی آمدنی ہو جاتی مگر تم نے میرے مشورے پر توجہ ہی نہ دی۔''

''مجھے دکھاؤ ذرا!'' میں نے کہا۔ کوشش یہی تھی کہ بے تابی ظاہر نہ ہو، ورنہ وہ چالاک شخص فوراً یہ سمجھ جاتا کہ میں نے کوئی موٹی اسامی تاڑ لی ہے اور یوں وہ مجھے مہنگے داموں ٹکٹ فروخت کرنے کی کوشش کرتا۔ میں بے نیازی سے بولا۔ ''کچھ ارادہ تو ہوا ہے میرا، یہ کاروبار کرنے کا شاید کچھ فائدہ ہو جائے۔''

''یقیناً...... یقیناً!'' داسو بولا۔ پھر اپنا بریف کیس اٹھا کر گود میں رکھا اور اسے کھولا، اس میں سے ایک چرمی البم نکالی جس کی بناوٹ بڑی خوبصورت تھی۔ وہ البم کھول کر اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بحری جہازوں کے وہ نادر و نایاب ٹکٹ ہیں جو اب دنیا میں ناپید ہو چکے ہیں۔'' میں بغور ایک ایک ٹکٹ دیکھنے لگا۔ سارے ہی ٹکٹ ایک دوسرے سے مختلف رنگ اور سائز میں تھے جن پر اجنبی اور نامانوس چہرے چھپے ہوئے تھے۔ مجھے اگرچہ کوئی تجربہ نہ تھا مگر میرے جیسے انسان کی بھی آنکھیں ان ٹکٹوں کو دیکھ کر گویا چندھیا سی گئیں۔ میں ان کی قدر و قیمت کے بارے میں پورے وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ بہت نایاب اور قدیم تھے۔ میرا رئیس زادہ دوست عارف سعیدی یقیناً انہیں دیکھ کر خوش ہوگا۔

داسو نے میرے چہرے پر اُبھرتے تاثرات کی چمک بھانپ لی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، پھر وہ ان کی اہمیت بتاتے ہوئے بولا۔ ''بحری جہازوں کے یہ قدیم ترین ٹکٹ اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب ہوائی جہاز ایجاد نہیں ہوئے تھے اور لوگ صرف بحری جہازوں پر ہی طویل سفر کیا کرتے تھے۔''

میں نے دانستہ منفی تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بھلا اب انہیں کون خریدنا پسند کرے گا، لوگ تو اب بحری سفر کے بجائے فضائی سفر کو ترجیح دینے لگے ہیں۔''

''غلط...... بالکل غلط!'' وہ بولا۔ ''شوق رکھنے والے افراد ہاتھوں ہاتھ انہیں خرید لیں گے، بیشک لوگ اب فضائی سفر کو ترجیح دیتے ہیں مگر وہ ٹکٹ عام ملتے ہیں جبکہ بحری جہازوں کے یہ ٹکٹ نایاب و ناپید ہو چکے ہیں۔''

''اچھا! کتنے پرانے ہیں یہ......؟'' میں نے بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

''یہ ٹکٹ سولہویں صدی کے ہیں، دیکھ لو۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا اور بات جاری رکھی۔ ''یہ چار سو سال پرانے ہیں، لوگ یہ جان کر ہاتھوں ہاتھ ان ٹکٹوں کو خریدنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

مجھے اعتراف تھا کہ میں اس کی باتوں سے متفق ہو گیا تھا مگر ابھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اطراف میں سناٹا طاری تھا، میں کافی دیر تک ان ٹکٹوں کو الٹ پلٹ کر بغور دیکھتا رہا، یوں میں اپنے طور پر ان ٹکٹوں کی قیمت اور فروخت کا اندازہ کرنے لگا مگر سچی بات تھی کہ میں صحیح طور پر ان کی قیمت کا اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو میں نے ہولے سے کھنکار کر واجبی سے لہجے میں داسو سے پوچھا۔ ''کیا لو گے ان سب کا......؟''

''بہت مہنگے ہیں یہ!'' داسو نے یہ کہنے سے قبل انتہائی گہری اور بھانپتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔

''پھر بھی پتا تو چلے آخر کتنے مہنگے ہیں یہ ٹکٹ!''

''تم نہیں خرید سکو گے، بہت مہنگے ہیں۔''

''یار! اب یہ مہنگے مہنگے کی گردان چھوڑو اور صاف صاف بتاؤ۔'' میں نے بالآخر بیزاری سے کہا۔

''پورے پانچ لاکھ!''

''کک...... کک...... کیا......؟'' میں گھبرا گیا۔ ''اتنی قیمت!''

''ہاں! میں نے کہا تھا نا اسلم میاں کہ یہ بہت مہنگے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''تین سو ٹکٹ ہیں اور قیمت بالکل مناسب ہے۔''

''میں خریدوں تو کیا قیمت لو گے؟''

''تمہارے لیے ہی تو پانچ لاکھ بتا رہا ہوں ورنہ ان کی قیمت اس سے بھی زیادہ ہے، میں نے انہیں حاصل کرنے کے لیے بڑی لمبی رقم دی یعنی پورے چار لاکھ! اب ایک لاکھ منافع تو میرا حق بنتا ہے۔''

''تین لاکھ منظور ہیں؟'' میں نے باریک سی آواز میں کہا۔

''نہیں!'' اس نے پہلی بار ناگواری سے اپنا سر ہلایا اور ٹکٹ سمیت کر البم میں لگاتا ہوا فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''پانچ لاکھ سے ایک پائی کم نہیں۔''

''چلو یار! کچھ دوستی کا ہی خیال کر لو، چار لاکھ دے دیتا ہوں نقد...... اسی وقت!''

مگر وہ زور زور سے نفی میں اپنا سر ہلانے لگا۔ ''نہیں...... نہیں ہرگز نہیں! تم دیکھ لینا کوئی دوسرا قدر دان ان نایاب و نادر ٹکٹوں کے مجھے بآسانی 9 لاکھ ادا کر دے گا۔''

دگنے منافع کی امید پر میرے سینے میں سانسیں اٹکنے لگیں، تاہم میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''چھوڑو یار! اب دنیا میں اتنے اندھے لوگ بھی نہیں رہتے۔''

''بات اندھے پن کی نہیں، قدر دانی کی ہے میرے ناقدرے دوست!'' وہ مستحکم اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں اسی قیمت پر بیچ کر دکھا دوں گا، تم نے میری فنکارانہ صلاحیتوں کو چیلنج کیا ہے، ناشتے کا شکریہ! میں چلتا ہوں۔''

وہ اپنا بریف کیس سنبھالتا ہوا اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے خریداروں سے رابطے کرنے ہیں، کچھ روز بعد میری بیٹی کی شادی ہے، اس کے لیے رقم کا بندوبست کرنا ہے مجھے۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا جانے لگا تو میں نے اسے روک کر پژمردہ لہجے میں کہا۔ ''دوست! تم نے تو دوستی کا بھی خیال نہیں کیا، میں تمہیں چار لاکھ اسی وقت دے سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ رُکھائی سے بولا۔ ''مجھے تمہاری یہ پیشکش منظور نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لحاظ کیے بغیر جانے لگا، میں بے بسی سے دانت چبانے لگا اور بالآخر میں نے اس کی لگائی ہوئی قیمت پر راضی ہوتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ میرے حوالے کرو ٹکٹ! میں تمہیں پانچ لاکھ دیتا ہوں۔''

درحقیقت میں ان نادر و نایاب ٹکٹوں کو کسی قیمت پر ہاتھوں سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں یہ سارے ٹکٹ اپنے رئیس زادے دوست عارف سعیدی کو لے جا کر دکھاؤں گا تو وہ انہیں منہ مانگی رقم دے کر خرید لے گا۔

داسو مجھے آمادہ دیکھ کر ایک لمحے کو غیر یقینی نظروں سے دیکھنے لگا اور پھر البم بریف کیس سمیت میرے حوالے کر دی۔ میں نے اسے چیک لکھ کر دے دیا۔ وہ یوں دوڑا جیسے اگر اسے ذرا بھی دیر ہو گئی تو بینک بند ہو جائے گا۔

اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میں انہیں عارف سعیدی کے ہاتھوں جلد سے جلد فروخت کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی خواہش میں ممبئی سے دہلی کی جانب عازمِ سفر ہوا۔ سفر میں نے بذریعہ ہوائی جہاز کیا تھا۔ ایئرپورٹ پر اترتے ہی سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ عارف سعیدی جو اب میرے اندازے کے مطابق ریاست جمال گڑھ کا نواب بن چکا تھا، وہ ان دنوں کہاں رہائش پذیر تھا۔ خیال تو یہی تھا کہ وہ اپنی جاگیر پر ہی مقیم ہوگا مگر اس کا ڈلہوزی میں بھی اپنا ایک محل تھا اور کیا خبر وہ وہیں رہائش پذیر ہو کیونکہ میرے محتاط اندازے کے مطابق عارف سعیدی بلاشبہ ایک امیر کبیر اور خاصی قد آور سیاسی شخصیت بن چکا تھا، لہٰذا اس کے متعلق تازہ موجودہ صورتحال اخبارات میں آتی رہتی ہوں گی۔ میں نے سب سے پہلے ایئرپورٹ سے نکلتے ہی ایک بک اسٹال کا رخ کیا اور تازہ اخبار خرید کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ جلد ہی اخبار کے اندرونی صفحات میں ایک متن کی خبر پر میری نگاہ پڑ گئی۔

''ریاست جمال گڑھ کا نواب اور معروف سیاسی شخصیت عارف سعیدی ڈلہوزی سے جمال گڑھ پہنچ چکے ہیں اور وہ ایک ہفتے تک اپنی جاگیر میں شکار کی غرض سے مقیم رہیں گے۔ مزید برآں اس دوران وہ کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گے۔''

یہ خبر پڑھنے کے بعد میں نے طمانیت کی ایک گہری سانس لیتے ہوئے اخبار کو گول کر کے اپنی جیب میں اڑسا اور جمال گڑھ جانے والی بس تلاش کرنے لگا۔ معلوم ہوا وہاں کوئی بس نہیں جاتی۔

مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ ایک ٹیکسی والے کو روک کر جب میں نے اسے جمال گڑھ چلنے کی بات کی تو اس نے فوراً گھبرا کر اپنے دونوں کانوں کو پکڑ لیا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ان دنوں جمال گڑھ اور اس کے اطراف کی بستیاں ہنگاموں کی زد میں تھیں۔ یہ بلوے اچانک ہی پھوٹ پڑے تھے اور کئی انسانوں کی ہلاکت خیزی ان بلوؤں کی بھینٹ کی صورت میں نمودار ہوئی۔

مقامی جاگیردار، پولیٹیکل ایجنٹ اور علاقے کے کمشنر غرضیکہ پوری حکومتی مشینری ان حالات دگرگوں پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف کار تھی مگر ابھی تک کوئی حل نہیں نکلا تھا اور کشیدگی میں بجائے کمی آنے کے بتدریج اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وجہ ان ہنگاموں کی یہ تھی کہ آبادی واضح طور پر دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی اور کوئی فریق اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے رضامند نہ تھا۔

جمال گڑھ کی طرف جانے والی تمام ٹریفک معطل کر دی گئی تھی۔

مجھے یہ ساری تفصیل ٹیکسی ڈرائیور نے بتائی تھی جسے جان کر میں پہلے ششدر اور پھر متوحش ہو گیا تھا۔ اگرچہ ممبئی میں رہتے ہوئے اخبارات میں اس قسم کی خبریں نظروں سے گزرتی رہتی تھیں لیکن کچھ درست اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ حالات اس قدر سنگین صورت اختیار کر لیں گے۔ اب ان حالات میں میرا جمال گڑھ پہنچنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے ان پانچ لاکھ روپوں کی مالیت کے خریدے ہوئے ٹکٹوں کی فکر ستانے لگی جن کی فروخت کا معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔

میں حیران پریشان کھڑا ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ تکنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اگر میں یوں ہی بے نیل و مرام واپس چلا جاتا تو پانچ لاکھ روپے میرے ڈوب جانے کا خدشہ دامن گیر تھا اور میں اتنے بڑے نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف جمال گڑھ کی طرف عازمِ سفر ہونا بھی ناممکن نظر آ رہا تھا کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے واضح لفظوں میں بتا دیا تھا کہ ان مخدوش حالات میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور جمال گڑھ جانے پر ہرگز آمادہ نہ ہوگا۔

میری بے بسی پر ٹیکسی ڈرائیور ہنس پڑا تھا، تاہم اس نے مجھ سے کہا کہ میں اگر چاہوں تو وہ مجھے کسی قریبی علاقے کی حدود تک چھوڑ سکتا ہے، وہاں سے میں بآسانی کسی مقامی جاگیردار کے تعاون سے جمال گڑھ تک پہنچ سکتا تھا۔

ان حالات میں بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی کے مترادف میں نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ میں فوراً ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ٹکٹوں والا بریف کیس میں نے ساتھ چپکائے رکھا تھا جس کے اندر پانچ لاکھ روپے کی مالیت کے ٹکٹوں کے علاوہ ایک عدد آٹومیٹک ریوالور اور چند جوڑے کپڑوں کے بھی رکھے ہوئے تھے۔

ریوالور میں نے ممبئی ہی میں کسی سے غیر قانونی طور پر خریدا تھا۔ میں نے ممبئی سے روانگی کے وقت حفظِ ماتقدم کے تحت اسے ساتھ رکھ لیا تھا مگر اب ان حالات میں مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں بغیر لائسنس اسلحہ لا کر میں نے کوئی بھیانک غلطی تو نہیں کی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے دوپہر ہونے تک مجھے ایک ایسے علاقے میں پہنچا دیا تھا جدھر پولیس کا دور دور تک نام و نشان نہیں نظر آ رہا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ہر قسم کا تنازع کونسل اور پولیٹیکل ایجنٹ ہی کی وساطت سے طے پا جاتا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی حد ختم ہوتے ہی قبائلی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ حکومت اس علاقے پر اپنا مکمل تسلط برقرار رکھنے میں ابھی تک ناکام تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے ایک جھونپڑی کے سامنے اتار دیا تھا۔ یہ چائے خانہ تھا، باہر مختصر سے احاطے میں چند فولڈنگ اسٹول پڑے تھے جن پر کچھ مقامی لوگ بیٹھے چائے یا قہوہ پیتے ہوئے باتوں میں مشغول تھے البتہ مجھے ٹیکسی سے اترتے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں عجیب سی حیرانی مترشح ہونے لگی تھی۔

پھر دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ آپس میں محوِ گفتگو ہو گئے تھے جیسے مجھے یکسر نظرانداز کر دیا ہو مگر پھر فوراً ہی میں نے ایک پُراسرار بات محسوس کی کہ ایسا نہ تھا۔ انہوں نے مجھے مکمل طور پر نظرانداز نہیں کیا تھا بلکہ دزدیدہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ میری حرکات و سکنات پر آنکھیں مرکوز کیے ہوئے تھے۔

میں حیران سا کھڑا رہا۔ یہ میرے لیے اجنبی ماحول تھا، سنگلاخ زمین، پہاڑ، جبہ نما لباس، سرخ، سانولے چہرے، نامانوس زبان بولتے ہوئے لوگ جن کے شانوں پر رائفل جھول رہی تھی۔ ظاہر ہے میرے جیسے ممبئی مقیم باشندے کے لیے ایسا ماحول ناقابلِ تصور تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی خواب کے زیرِ اثر ہوں اور میری اچانک آنکھ کھلے گی تو میں خود کو ممبئی میں موجود پاؤں گا۔

ادھر وہ بھلا مانس ٹیکسی ڈرائیور شاید اس جھونپڑے نما قہوہ خانے کے مالک کا آشنا تھا۔ وہ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور اس دوران دو ایک بار میری طرف اشارہ بھی کیا، اس کے بعد میرے قریب آ کر بولا۔ ''ایشلے اپنے دو خچر معقول کرائے پر تمہیں دینے کے لیے راضی ہے کیونکہ یہ اس علاقے کا سردار ہے، تم اسے اگر پانچ سو روپے دے دو تو یہ اپنا ایک آدمی تمہارے ساتھ کر دے گا جو تمہیں خچر پر بٹھا کر بآسانی جمال گڑھ تک چھوڑ آئے گا۔''

ناچار میں نے پانچ سو روپے جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے رقم لے کر ایشلے نامی اس چائے خانے کے مالک کو جا کر دے دیے پھر تھوڑی دیر بعد ہی ایک عمر رسیدہ شخص دو خچروں کو میرے قریب لے آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس جانے والی سڑک پر ہولیا۔ وہ خاصا پُرجوش اور خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ میں نے اسے کرائے کے علاوہ معقول بخشش سے بھی نوازا تھا۔

وہ عمر رسیدہ شخص اب میرا گائیڈ تھا۔ وہ کم گو تھا۔ اس نے مجھے اپنے مخصوص انداز سے سلام کیا پھر مجھے خچر پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اچھل کر خچر پر سوار ہو گیا اور لگام مضبوطی سے تھام لی۔ یہ میرا خچر سواری کا پہلا سفر تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں گر نہ پڑوں کیونکہ میں نے دوسرے ہاتھ سے بریف کیس کو بھی تھام رکھا تھا جو جانے کیوں مجھے اب وزنی لگنے لگا تھا۔

ہم دونوں خاموشی سے عازمِ سفر ہو گئے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی زبانوں سے ناواقف تھے اور گویا زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم والا معاملہ تھا۔

میرا گائیڈ مجھے نیم تاریک بل کھاتے، اونچے نیچے پہاڑی دڑوں سے گزارتا ہوا لے جا رہا تھا۔ راستہ کٹھن اور ناہموار ہونے کی وجہ سے مجھے خچر پر جم کر بیٹھے رہنے کی وجہ سے خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ ہر لحظہ گر پڑنے کا خوف الگ دامن گیر تھا کیونکہ گرنے کی صورت میں میری ہڈی، پسلی ایک ہونے کا خطرہ موجود تھا۔

راہ میں آنے والے بلند و بالا پہاڑ برف اور سرمئی بادلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دوسری جانب ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی جس کی سمت دیکھتے ہوئے بھی ہول آتا تھا۔ کئی مرتبہ تو گھبرا کر میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور خود کو حالات اور خچر کے حوالے کر دیا مگر اس کے برعکس میرا گائیڈ بہت مطمئن انداز میں دوسرے خچر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تکان و خوف کے آثار نہ تھے بلکہ اس کی جگہ بشاشت کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان پہاڑوں میں ہی پلا بڑھا تھا۔ یہ سنگلاخ اور پُرخطر راستے اسے بھلا کیسے خوف زدہ کر سکتے تھے۔

وہ سارے راستے بآوازِ بلند کوئی پہاڑی گیت گاتا رہا تھا جس کے بول میرے لیے اجنبی تھے، تاہم اس کی آواز میں لوچ اور درد تھا۔ رقت طاری کر دینے والی اس کی پُرسوز آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی المیہ گیت تھا۔

راستے میں کئی جگہ فائرنگ کی آوازیں اور انسانی چیخوں کی صدائیں سنائی دیں۔ پہاڑی سنگلاخ دڑوں میں ان کی آوازیں بازگشت بن کر دیر تک گونجتی رہتی تھیں۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا اور جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔ کوئی گولی میری طرف بھی آ سکتی تھی جو چشم زدن میں مجھے ہلاک کر دیتی۔ میں خود کو کوسے جا رہا تھا کہ میں ممبئی سے کیوں نکلا......؟

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، چار بجکر پینتالیس منٹ ہو رہے تھے تبھی میرے گائیڈ نے اشارے سے مجھے بتایا کہ اب ہم کچھ دیر بعد جمال گڑھ کی ریاست کی حدود میں داخل ہونے والے ہیں، ساتھ ہی اس نے ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید بتایا کہ یہ راستہ سیدھا ہمیں جمال گڑھ تک پہنچا دے گا۔

یہ نوید جانفزا سن کر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ میرے پانچ سو روپے رائیگاں نہیں گئے تھے ورنہ اطراف و اکناف میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے مجھے سارے راستے یہی دھڑکا لگا رہا تھا کہ میں اپنی منزلِ مقصود تک مشکل سے ہی پہنچ پاؤں گا۔

ہم ابھی اس راستے پر چند قدم ہی چلے تھے کہ قریب ہی سے گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ ایک اندھی گولی نے گائیڈ کا کام تمام کر دیا۔ وہ بیچارہ چیخ مار کر خچر سے گرا اور وہیں دم توڑ دیا۔ وہ نادیدہ فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا اور اس کی آخری چیخ بڑی بھیانک اور کربناک تھی جس نے میرا دل دہلا کر رکھ دیا تھا۔

میری رگوں میں خون جمنے لگا اور خوف سے میں بری طرح کانپنے لگا۔ فائرنگ کی گھن گرج ہنوز جاری تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں خچر سے اترا اور زمین بوس گائیڈ کی طرف بڑھا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اب میرا کیا ہوگا؟ میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ کوئی بھولی بھٹکی گولی میرا بھی کام تمام کر سکتی تھی۔ یہ علاقہ میرے لیے اجنبی تھا۔ شکر تھا کہ گائیڈ نے مرنے سے پہلے مجھے منزل کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیا تھا۔

میں آگے روانہ ہونے کے لیے خچروں کی طرف پلٹا تو یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ وہ دونوں گولیوں کی خوفناک گھن گرج سن کر بھاگ چکے تھے۔ ان کو ڈھونڈنا خطرے سے خالی بھی تھا اور ناممکن بھی!

معاً مجھے عقب میں کچھ فاصلے پر کئی اسلحہ بردار انسان نظر آئے۔ وہ وحشت ناک انداز میں مجھے ہاتھ ہلا ہلا کر یوں اشارے دے رہے تھے جیسے شکاری کو اس کی کمین گاہ سے نکالا جائے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، میری جان پر بن آئی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دوڑ لگا دی۔

میرے عقب میں فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں گرتا پڑتا، دوڑتا رہا۔ میرے اندر بار بار ایک ہی گردان ہو رہی تھی۔

''بھاگ جاؤ...... بھاگو...... ورنہ اس پہاڑی گائیڈ کی طرح تم بھی بے موت مارے جاؤ گے۔'' اور یوں میں اپنا بریف کیس مضبوطی سے دبوچے بغیر رکے دوڑتا چلا گیا۔

عقب سے اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں، کئی گولیاں دائیں بائیں سنگلاخ دڑوں سے اچٹ کر بالکل میرے قریب سے بھی گزری تھیں، چند ایک کی لپکتی ہوئی جھپک مجھے اپنے چہرے اور ناک کے بالکل قریب ہی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور سر پر پاؤں رکھے دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک پہاڑی درے سے بل کھا کر خطرناک لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں دوڑتے دوڑتے تھک کر بے حال ہو رہا تھا، میری ٹانگیں مارے تکان کے لرز رہی تھیں، سینہ بری طرح سانسوں کے بے ترتیب زیر و بم کے زیرِ اثر پھول رہا تھا، دماغ بری طرح جھنجھنا رہا تھا، آنکھوں کے سامنے تارے گردش کرنے لگے تھے مگر میں نے رکنا مناسب نہ سمجھا۔

سنگلاخ راہ گزر پر مجھے کئی بار ٹھوکر لگی تھی اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا تھا مگر جس کے سر پر موت کا خوف سوار ہو، وہ بھلا ان تکالیف کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ مجھے یہاں آ کر سخت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ زیادہ دولت کمانے کی لالچ میں اپنی جان داؤ پر لگا بیٹھا تھا مگر اب اوکھلی میں سر دے دیا تھا تو موسلوں سے کیا ڈرنا......!

سنگلاخ دڑے کی حدود ختم ہوئی تو اچانک میں ٹھٹھک کر رک گیا اور پھر اگلے ہی لمحے میں خوشی کے مارے چیخ اٹھا۔ میں اس وقت ایک بلند چوٹی پر کھڑا تھا اور مسرت بھری نظروں سے نشیب میں ایک بستی کے آثار کو دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

خلافِ توقع جمال گڑھ کی وادی خاصے طول و عرض پر پھیلی ہوئی تھی۔ سر بہ فلک پہاڑوں اور سرسبز و شاداب مرغزاروں میں گھری یہ وادی بلاشبہ قدرت کی صناعی کا قابلِ مثال نمونہ تھی۔ بادی النظر میں یہ وادی پیالہ نما نظر آتی تھی جیسے پیالہ الٹا رکھ دیا گیا ہو۔ وادی میں ایک جانب نواب عارف سعیدی کا شاندار اور پُرشکوہ قلعہ نما محل تھا جو درختوں کے حصار میں قید نظر آ رہا تھا، دوسری سمت ایک کچی آبادی تھی جو خاصی دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ وادی گاؤں سے ذرا ہی بڑی تھی۔ ایک بڑی سی مسجد اور چرچ تھا۔ ایک سمت پانچ منزلہ جدید ہوٹل کے علاوہ کچھ قہوہ خانے بھی تھے۔

وسط میں ایک چھوٹا سا بازار تھا، تین بڑی سڑکیں تھیں جنہیں شاید نواب کے حکم پر پختہ کرا دیا گیا تھا۔ ان تینوں میں ایک سڑک نواب کے محل کی طرف جاتی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق وادی کی کل آبادی تقریباً پانچ ہزار نفوس پر مشتمل رہی ہوگی جس کے اطراف لہلہاتے کھیت اور کہیں کہیں انگور، خوبانی، سیب اور آڑو کے باغات بھی نظر آ رہے تھے۔

جب میں آبادی میں داخل ہوا تو شام ہونے والی تھی۔ جدید طرزِ تعمیر کا حامل ہوٹل کچھ زیادہ بڑا نہ تھا مگر بستی کے ماحول کے برعکس اس میں سیاحوں کے لیے خاصی سہولتیں موجود تھیں۔ مجھے ہوٹل میں ایک ایسا کمرا ملا جو خاصا چھوٹا اور نیم تاریک تھا۔ اسے دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں تھا کہ ہوٹل کے مالک نے کم سے کم جگہ پر زیادہ سے زیادہ کمرے بنا رکھے تھے۔

نئی جگہ، نیا ماحول اور اس پر مستزاد اجنبی مخدوش فضا میں اس رات مجھے نیند ٹھیک طرح سے نہ آ سکی تھی۔ ہر بار چشمِ تصور میں ادھیڑ عمر گائیڈ کا چہرہ ابھرنے لگتا جو بے چارہ بے گناہ مارا گیا تھا۔ جو مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ میرا قصور کیا تھا، کیوں مجھے جینے کے حق سے تم نے محروم کیا۔

علی الصباح ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے استقبالیہ کاؤنٹر پر جا کر فون کرنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے کہا۔ ''میں ایک مقامی کال کرنا چاہتا ہوں۔''

''کہاں کریں گے؟'' استقبالیہ کے عقب میں کھڑے ایک چالیس سالہ شخص نے پوچھا۔ وہ ہوٹل کا منیجر تھا۔ صحت قابلِ رشک تھی۔

''میں نواب عارف سعیدی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میری بات سن کر وہ چند ثانیے تو حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا پھر ٹیلیفون سیٹ میری جانب کھسکا دیا، البتہ اب اس کی آنکھوں میں نامعلوم سی الجھن تیر گئی تھی۔ شاید اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سے نواب کا نمبر معلوم کیا اور ڈائل گھما دیا۔ رابطہ ہونے پر ایک کرخت آواز نے میرا نام، فون نمبر اور رہائش کا دریافت کیا۔ پھر بولا۔ ''نواب صاحب اس وقت محل میں موجود نہیں ہیں، ان کے پہنچتے ہی انہیں تمہارے بارے میں بتا دیا جائے گا اور اگر انہوں نے ملنا مناسب سمجھا تو فون پر اطلاع کر دی جائے گی۔'' اتنا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور کریڈل پر پٹخنے کے انداز میں رکھ دیا۔

''ذرا آہستہ!'' منیجر نے مجھے ٹوکا۔

''سوری......!''

''نواب، جمال گڑھ میں رہنے والے سیاحوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔'' اس نے بتایا۔ ''ان کا خیال ہے کہ وہ اپنا اور ان کا وقت ضائع کرتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں مجھے تضحیک محسوس ہوئی۔

''میں سیاح نہیں ہوں، ان کا دوست ہوں، ان سے ملنے آیا ہوں ممبئی سے......!'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں تشکیک اور تشویش پائی جاتی تھی۔

میں شکست خوردہ سا اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور پرانے رسالے اور اخبارات میں سر کھپانے لگا۔ مقصد وقت گزاری تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد دروازے پر کسی نے دستک دی اور ساتھ ہی ہوٹل کا ایک لمبا تڑنگا ویٹر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''آپ کا فون ہے جناب! تشریف لائیں گے آپ......؟'' اس کے لہجے میں احترام تھا۔

''میرا فون......؟'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ''میرا تو یہاں کوئی شناسا نہیں۔''

حالات نے میری عقل خبط کر ڈالی تھی۔ مجھے کچھ دیر بعد یاد آیا کہ ضرور یہ فون نواب عارف سعیدی کا ہوگا۔ میری حیرت رفع ہوئی اور میں کمرے سے نکلا۔ میں استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک جواں سال لڑکی کو ریکارڈ بک پر کچھ اندراج کرتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ریسیور میری طرف بڑھا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نواب بیگم کا فون ہے جناب آپ کے لیے......!'' اس کے لہجے میں یکایک حیرت عود کر آئی۔ ''نواب بیگم محل سے بات کر رہی ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

میں نے جھپٹ کر ریسیور اس کے ہاتھ سے لیا۔ وہ دوبارہ رجسٹر پر جھک گئی۔

''ہیلو، ہیلو......!'' میں نے حیرت اور بے تابانہ انداز میں ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ چند ثانیے کے لیے تو میں بت بنا رہ گیا کہ میں اسے اپنے بارے میں کیا بتاؤں، معلوم نہیں عارف سعیدی نے کبھی اس سے میرا ذکر کیا بھی تھا کہ نہیں......!

''میرا نام اسلم قیصرانی ہے۔'' بالآخر میں نے ہمت کر کے بتایا۔ ''اور میں عارف سعیدی کا دوست ہوں اور ممبئی سے ان کے لیے کچھ نادر و نایاب ٹکٹ لے کر آیا ہوں، ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

میری بات سن کر دوسری جانب سے ایک قہقہہ سا ابھرا۔ ''میں آپ سے واقف ہوں جناب! نواب آپ کا اکثر ذکر کرتے رہے ہیں مجھ سے!''

میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

پھر اس نے گہری متانت سے کہا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو آج کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں، اس وقت عارف محل میں موجود نہیں ہیں، کہیں گئے ہوئے ہیں مگر تب تک وہ آ جائیں گے، آپ ان سے مل لیجیے گا۔''

''جی بہتر ہے...... میں نو بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں مسرت سے کھل اٹھا تھا۔ گویا عارف سعیدی مجھے اب تک نہیں بھولا تھا۔ اس کی بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ پونے نو بجے کار مجھے لینے کے لیے ہوٹل آ جائے گی۔ ادھر ہوٹل کا منیجر جانے کب سے میرے عقب میں نازل ہو چکا تھا، اس نے ساری گفتگو سن لی تھی۔ مجھے فارغ پا کر وہ گھبرا کر بولا۔ ''سس...... سر! آپ کب سے نواب صاحب کو جانتے ہیں؟''

اس کے لہجے میں خوشامد عود کر آئی تھی۔ میں اس کے لیے یکدم اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ میں نے بھی احساسِ تفاخر سے بتایا۔ ''ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔''

''ممبئی میں رہتے ہیں آپ؟'' اس بار میرے قریب کھڑی ایک لڑکی نے مجھ سے استفسار کیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی اور چہرے کے خدوخال جاذبِ نظر تھے۔ وہ کوئی سیاح تھی شاید!

''جی ہاں! آپ کا خیال عین درست ہے۔''

''اور آپ......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''میں دہلی سے تعلق رکھتی ہوں، سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آئی ہوں۔'' اس نے چند سوالات میری ذات سے متعلق کیے، پھر کئی سوال نواب سعیدی کے بارے میں پوچھے۔ مجھے اس کے پے در پے استفسار سے یوں لگا جیسے وہ نواب سعیدی کے بارے میں مجھ سے کوئی خاص بات اگلوانے کی تگ و دو میں ہے لہٰذا میں فوراً ہی محتاط ہو گیا۔

''کیوں......؟'' میرے ذہن میں تشکیک زدہ سوالیہ نشان ابھرا۔ آخر یہ لڑکی نواب کا ماضی کھنگالنے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟

وہ بھی جیسے میرے گریز پا کو بھانپ کر خاموشی سے ایک طرف کو کھسک گئی۔ میں نے اسے باہر نکل کر ایک سیاہ رنگ کی کار میں بیٹھتے دیکھا۔ اس کار کا نمبر بتا رہا تھا کہ اس کا رجسٹریشن ایران میں ہوا تھا۔

لڑکی کے جاتے ہی منیجر نے مجھ سے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بہت خوبصورت لڑکی تھی نا......؟''

پتا نہیں اس بے وقوف منیجر کا اصل نام کیا تھا البتہ ہوٹل میں وہ پیڈرو کے نام سے مشہور تھا۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملانا جانے کیوں ضروری سمجھا اور مختصراً بولا۔ ''ہاں شاید......!''

میں مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے ذہن میں اب بار بار صرف ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ اگر اس لڑکی کا تعلق واقعی دہلی سے تھا تو پھر اس کی کار کا رجسٹریشن ایران میں کیوں ہوا تھا اور اگر کار اس کی ملکیت نہ تھی تو پھر وہ ایک غیر ملکی رجسٹریشن والی کار میں کیوں گھوم رہی تھی؟

☆......☆......☆

حسبِ وعدہ نواب عارف سعیدی کی بیوی نے میرے لیے کار بھیج دی۔ کار ٹھیک پونے نو بجے ہوٹل کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور چپ چاپ کار میں سوار ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور کی برابر والی سیٹ منتخب کی تھی۔ ڈرائیور مقامی نوجوان نظر آتا تھا۔ اس نے جب کار اسٹارٹ کی تو مجھے تعجب ہوا کہ اس کے بغلی ہولسٹر میں پستول جھانک رہا تھا جسے دیکھ کر مجھے انجانا سا خوف محسوس ہوا۔

میں اُس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''خیریت تو ہے، تم مسلح کیوں ہو؟ کیا راستے میں شرپسندوں کا خدشہ ہے؟''

وہ میری صورت دیکھنے لگا مگر میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور منہ پھیر کر ونڈ اسکرین سے باہر تکنے لگا۔ ذرا دیر بعد ہی کار قلعے نما محل میں داخل ہو گئی اور پورٹیکو میں رُک گئی۔ وہاں سیڑھیوں پر ایک ادھیڑ عمر خادمہ نے میری رہنمائی کی۔ وہ مجھے محل کی نیم روشن غلام گردشوں سے گزارتی ہوئی ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

''آپ اندر تشریف لے جائیں۔'' اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

میں اندر داخل ہوا تو دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔ کمرے کی سجاوٹ، تزئین و آرائش دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم ایسا ہی تھا جیسے کہ عالی مرتبت نوابوں کا ہونا چاہیے۔ اندر گھستے ہی مجھے احساس ہوا کہ وسیع و عریض کمرا اس وقت خالی پڑا ہے اور میں تنہا کمرے میں موجود ہوں۔ میں ذرا جھجکتے ہوئے آگے بڑھا اور ایک بڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ صوفہ نرم اور گداز تھا۔

میں اب صوفے پر بیٹھا بار بار بے چینی کے عالم میں پہلو بدلنے لگا، ساتھ ہی طائرانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قالین، فانوس، دیوار گیر الماریاں، رنگین ٹی وی اور متعدد دوسری اشیاء میری نظروں میں نہیں سما رہی تھیں۔

کمرے میں موجود ہر شے اتنی بیش قیمت اور نفیس تھی کہ میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹنے لگیں۔ ملک کے دور افتادہ گوشے میں جدید ترین اشیاء کی موجودگی میرے لیے حیران کن تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی اس حیرت پر قابو پا لیا۔

اچانک پردہ ہلا اور نواب عارف سعیدی کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ میں فوراً اسے نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرش پر بچھے دبیز قالین نے اس کے قدموں کی آہٹ کو جذب کر لیا تھا۔

''جمال گڑھ میں خوش آمدید جناب اسلم قیصرانی صاحب!'' وہ میرے قریب آ کر بولی اور میں ٹھٹھک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط : 2

وہ جیسے کوئی اپسرا تھی۔ چہرے کے نقوش تیکھے اور خدوخال دل آویز اور دلکش جاذبیت لیے ہوئے تھے۔

''میرا نام رباطہ ہے۔'' اس نے سریلی آواز میں کہا۔ وہ ترکمانستان سے تعلق رکھتی تھی۔ میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور جھک کر اسے تعظیم دی۔ اس کے قرب نے میرے وجود میں طوفان سا بپا کر دیا تھا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ''سعیدی کو آنے میں ابھی تھوڑی دیر اور ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں، میں انتظار کرلوں گا۔'' میں نے شائستگی سے کہا۔

''تب تک آپ کچھ نوش فرمالیں۔'' عارف سعیدی کی بیوی نے مسکرا کر کہا اور گھنٹی بجادی، پھر پوچھا۔ ''سفر کیسا رہا، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''خاصا آرام دہ سفر تھا۔'' میں نے غلط بیانی کی۔ مجھے اپنے جھوٹ پر ہنسی آگئی۔ مجھے دشوار گزار، پُرخطر ہولناک راستے یاد آنے لگے جو میں نے خچر پر سوار کاٹے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے تصور میں عمر رسیدہ گائیڈ کا خیال بھی ابھرا جس کی لاش کو میں بے گور و کفن چھوڑ کر بھاگا تھا۔

اس دوران ملازمہ کافی، پھل اور بسکٹ وغیرہ لے آئی تھی۔ یہ سب چیزیں ایک نفیس سی ٹرالی میں سجی ہوئی تھیں۔ اس نے پلیٹیں ٹرالی سے اٹھا کر میرے سامنے سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیں اور کافی کے برتن رکھنے کے بعد وہ الٹے پیروں کمرے سے نکل گئی۔ یہ سارا کام اس نے مشینی انداز میں چند لمحوں میں سرانجام دیا تھا۔ اس نے رباطہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

کافی پینے کے دوران رباطہ نے مجھ سے ممبئی کے بارے میں سوالات کیے۔ اسے ممبئی کی چمکتی دمکتی جھلملاتی روشنیاں، سربہ فلک عمارتیں، کشادہ سڑکیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگ، ٹریفک کا سیل رواں پسند تھے۔ وہ اخبارات کے ذریعے ممبئی کے بارے میں آگاہی حاصل کرتی رہتی تھی۔ اسے دکھ تھا کہ ممبئی ان دنوں ہنگاموں، نسلی تعصب، دہشت گردی اور تخریب کاری کا مرکز بن گیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ ''یہاں کے حالات بھی مختلف نہیں، کیا یہ علاقہ ڈاکوؤں کا مسکن بن چکا ہے؟''

''نہیں تو......! ڈاکو تو یہاں نہیں ہوتے، تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟'' وہ جیسے میرے سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''آپ کا جو ڈرائیور مجھے ہوٹل سے یہاں لایا تھا، میں نے اسے اسلحہ بہ دست دیکھا تھا۔'' میں نے وضاحتی جواب دیا۔

''او، اچھا......!'' اس نے اپنے ہونٹ دائرے کی صورت میں سکیڑے۔ ''ویسے یہاں ڈاکو وا کو نہیں ہوتے البتہ کچھ قبائل آپس کے جھگڑوں میں ملوث رہتے ہیں جن کی وجہ سے یہاں کے حالات کشیدہ ہو جاتے ہیں، اس لیے احتیاط کے پیش نظر نہ صرف محل کے محافظوں بلکہ ہر شخص کو مسلح رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔''

سچی بات یہ تھی کہ میں اس کے لہجے سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد عارف سعیدی آگیا۔ اگرچہ میں نے اسے پورے پچیس سال بعد دیکھا تھا، اس کے باوجود میں نے اسے بغیر دشواری کے پہچان لیا۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں کوئی فرق نہ آیا تھا، سوائے اس کے کہ وہ کچھ فربہی مائل ہو چکا تھا اور چہرے پر کرختگی آگئی تھی۔

وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہوگیا۔ وہ مجھے فوراً پہچان گیا تھا۔ اگرچہ میری آمد اس کے لیے غیر متوقع اور اچانک تھی مگر باوصف اس کے وہ مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ملا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی موجودگی بھی بھول گیا تھا، نوابی کا رعونت آمیز لبادہ بھی اتار پھینکا تھا اور مجھ سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا اور خوب گرم جوشی سے گلے ملا تھا۔

''ارے......رے......رے...... بھائی! میں بہت کمزور ہوں، تم نے تو میری ہڈیاں کڑکڑا دیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔ اس کی دوستانہ گرفت میں بڑی گرم جوشی تھی، سانس تک لینا دشوار ہونے لگا تھا۔ عارف سعیدی نے ایک قہقہہ لگا کر مجھے چھوڑ دیا۔ رباطہ بھی مسکرائی۔

''معاف کرنا اسلم! مجھے ذرا بزنس کے سلسلے میں جمال گڑھ سے باہر جانا پڑ گیا تھا ورنہ میں فوراً تم سے ملتا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''مجھے یہاں مکمل آرام ملا۔''

رباطہ نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''دیواس کھنہ سے کیسا معاملہ رہا؟''

''حکومت کی طرف سے اسے طویل مدت کے لیے قرضہ مل جانے کی وجہ سے معاملہ نہ پٹ سکا۔'' عارف سعیدی نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اب میں کل نیو دہلی جا رہا ہوں تاکہ اسے قرضے کی فراہمی منسوخ کی جاسکے۔''

رباطہ کے بشرے پر تشویش ابھر آئی۔ وہ اپنے شوہر کا چہرہ تکنے لگی۔

سعیدی نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''آؤ اسلم! اب ذرا تم سے باتیں ہو جائیں۔'' وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرا بھی خاصا وسیع و عریض تھا، یہ بھی نفیس اشیاء سے مزین تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی گئی تھی۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے وائن کیبنٹ سے دو گلاسوں میں شمپئن انڈیلی اور ایک میری طرف بڑھا دیا۔ یہ اعلیٰ درجے کی شمپئن تھی۔ میں نے بلا جھجک گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''یہ دیواس کھنہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک مشہور صنعت کار ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''پورے ہندوستان میں اس کا بزنس پھیلا ہوا ہے، وہ ایک فنانس کمپنی اور اس کے تحت چلنے والے کئی بڑے ذیلی اداروں کا مالک ہے، جمال گڑھ آتے ہوئے تم نے راستے میں کچھ جدید عمارتیں دیکھی ہوں گی، یہ دیواس کھنہ نے ہی بنوائی ہیں، اس کا خیال ہے کہ چند برسوں میں جمال گڑھ میں آنے والے سیاحوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے گا اور اس وقت یہ رہائشی عمارتیں اس کے لیے بڑی منفعت بخش ثابت ہوں گی جبکہ میرا خیال مختلف ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں جمال گڑھ کا حسن اس کی سادگی اور قدامت میں پوشیدہ ہے اور ان عمارتوں نے اس علاقے کے قدرتی حسن کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔''

میں نے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ یہی مناسب تھا، کیا پتا وہ کن عمارتوں کی بات کر رہا تھا۔ میرا گائیڈ تو مجھے نامعلوم اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے لے کر جمال گڑھ پہنچا تھا۔

''ویسے ایک بات بتاؤں اسلم! تم سے اب کیا چھپانا، درحقیقت دیواس کھنہ اس علاقے میں میرا حریف ہے، وہ ان عمارتوں کو تعمیر کرانے کے سلسلے میں دیوالیہ ہو چکا ہے، ادھر فنانس کمپنیوں سے اعتماد اٹھ جانے کی وجہ سے شراکت داروں نے بھی اس سے اپنی رقوم کی واپسی کا تقاضہ شروع کر دیا ہے، اس کی پوری کوشش ہے کہ وہ جلد از جلد حکومت سے قرضہ لے کر اپنی بگڑی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دے سکے۔''

سعیدی نے بعد میں خود ہی مجھے ساری تفصیل بتائی۔ میں نے اس مرتبہ بھی خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

''اچھا اب تم بتاؤ خیر تو ہے، کیسے آنا ہوا؟'' اس نے پوچھا اور پھر بولا۔ ''میں تمہیں یاد تو کرتا تھا مگر پتا نہ ہونے کی وجہ سے ملنے کی کوشش نہ کر سکا۔''

مجھے اس کے منہ سے یہ بات سن کر خوشی ہوئی کیونکہ مجھ جیسے نادار اور غریب الحال دوست کو بھلا ایک نواب کیونکر یاد رکھ سکتا تھا مگر یہ نواب عارف سعیدی کی دوست نوازی تھی کہ وہ مجھے اب تک نہیں بھولا تھا۔ جانے کیوں مجھ پر فرط جذبات سے رقت طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نکالتا تو رندھے ہوئے گلے کی وجہ سے میری آواز بھرّا جاتی، اس لیے میں نے کچھ کہے بغیر اپنا بریف کیس کھولا، اس میں ٹکٹوں والا چرمی البم نکالا اور اس میں موجود سارے ٹکٹ میز پر ایک ایک کر کے پھیلا دیے۔

''اوہ......!'' عارف سعیدی کے ہونٹوں سے متحیرانہ آواز برآمد ہوئی۔ ٹکٹوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک عود کر آئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور حلق سے برآمد ہونے والی بے معنی آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ کوئی بیش قیمت خزانہ لگ گیا ہو۔ اس کی یہ کیفیت مجھ سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے ٹکٹ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹکٹوں کو دیکھنے اور انہیں جانچنے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔

میں دھڑکتے دل سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ خاصی دیر تک ٹکٹوں کے معائنے میں الجھا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک نیلے رنگ کے ٹکٹ کو کچھ زیادہ ہی غور سے دیکھ رہا تھا جو جزائر سراندیپ کی ایک جہاز راں کمپنی کا جاری کردہ تھا۔ اس پر چھوٹی بڑی باریک باریک لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا، شاید یہ ماضی کے سراندیپ اور حال کے سری لنکا کا نقشہ تھا۔ وہ نہایت باریک بینی سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ میں اپنی پلکیں جھپکائے بغیر اس کا چہرہ تکتا رہا۔ اس کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے میز پر پھیلے ہوئے ٹکٹوں کو یکجا کیا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''کدھر سے مارے اتنے سارے ٹکٹ!'' وہ جیسے بے ترتیب ہوتی سانسوں کے درمیان بولا۔ ''سچ کہوں مجھے خاص طور پر ان ٹکٹوں کی تلاش تھی۔''

''میں ٹکٹوں کا بیوپاری نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے یہ ٹکٹ تمہارے شوق کی خاطر حاصل کیے ہیں۔'' میں نے بظاہر ہموار مگر اندر سے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ ''تمہیں پسند ہیں تو رکھ لو یار......!''

''قیمت بتاؤ؟'' وہ بیتابی سے بولا۔ وہ نواب تھا، جدی پشتی نواب......! پسند آ جانے والی چیز کو خریدنے کے لیے بھاؤ تاؤ کرنا نہیں جانتا تھا۔ ''تم پسند کی بات کر رہے ہو اسلم! میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں انہیں ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں چھپا کر رکھ لوں، تمہیں کیا معلوم کہ انجانے میں تم کتنی بیش قیمت چیز خرید چکے ہو۔''

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ٹکٹ اسے پسند آ گئے تھے۔

''کیا لو گے، جلدی بتاؤ؟ میں ہر قیمت پر انہیں خریدنا چاہتا ہوں۔''

''جو مناسب سمجھو، دے دو، اب دوستوں سے کیا حساب کتاب کرنا یار!'' میں نے عیاری سے کہا۔

''میں اس وقت تمہیں پچاس لاکھ دے سکتا ہوں، بولو منظور ہے؟'' وہ نوابانہ رعونت سے بولا۔ اس کی بات سن کر جیسے میرے دل کی دھڑکنیں رک گئیں۔ میرے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ میرے پانچ لاکھ میں خریدے گئے ٹکٹوں کی اتنی قیمت لگائے گا۔ میرا دل خوشی اور کامیابی کے بے پایاں جوش تلے پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ عارف سعیدی نے ان ٹکٹوں کی جو قیمت لگائی تھی، وہ میری توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ وہ قدیم ٹکٹوں کا شوقین تھا اور ان کی صحیح معنوں میں قدر و قیمت جانتا تھا اور اس سلسلے میں وہ دھوکے میں نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا۔

''منظور ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنوں میں شدید اضافہ ہو گیا تھا، البتہ میری کوشش یہی تھی کہ خوشی کی اچانک پورے وجود میں چھا جانے والی اس لہر کو ظاہر نہ ہونے دوں۔

''میں تمہیں نیو دہلی یا ممبئی کے بینک کا چیک دے دیتا ہوں، اب یہ ٹکٹ میرے ہو گئے۔'' وہ بولا۔

''بے شک!'' میں مسرور چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو نقد قیمت دے دو، میرے لیے یہ زیادہ مناسب رہے گا۔'' نہ جانے کیوں مجھے اس کی چیک کی تجویز پسند نہیں آئی تھی جبکہ میں نے خود چیک دے کر یہ ٹکٹ خریدے تھے۔

''کیوں......؟ چیک میں بھلا کیا برائی ہے، کیا تم پچاس لاکھ کی خطیر رقم ممبئی تک لے جاؤ گے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میں کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا، براہ مہربانی تم نقد دے دو۔''

''نہیں!'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''جمال گڑھ کے حالات ان دنوں معمول پر نہیں ہیں۔'' اس نے میری تجویز مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ممبئی کے بینک کا چیک دے دیتا ہوں، تم کل میرے ساتھ ممبئی چلو...... جب تک چیک کیش نہیں ہو جاتا، میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' وہ اتنا کہہ کر چند ثانیے رکا، پھر گلاس میں بچی ہوئی آب ارغوان کا ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اسلم! تم میرے دوست ہو، ایک اچھے دوست......! میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا اور نہ ہی تمہیں کسی قسم کا دھوکا دینا چاہتا ہوں، ٹکٹوں کا یہ ذخیرہ انتہائی بیش و نایاب ہے بالخصوص یہ نیلے رنگ کا ٹکٹ......! یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ٹکٹ ہے، جزائر سراندیپ کی ایک جہاز راں کمپنی نے اسے طبع کرایا تھا لیکن پھر اس کے بعد اُس کے دفتر میں آگ لگ گئی تھی اور سارے ٹکٹ جل کر خاک ہو گئے تھے، یہ ٹکٹ اس لیے جلنے سے بچ گیا تھا کہ ایک مسافر کے نام جاری ہو چکا تھا، ایک روایت کے مطابق اس ٹکٹ پر سری لنکا میں مدفون کروڑوں کے خزانے کا نقشہ درج ہے اور اگر یہ روایت درست ہے تو صرف اس ایک ٹکٹ کی قیمت ہی دس لاکھ ڈالر سے زیادہ بین الاقوامی مارکیٹ میں بنتی ہے۔'' نواب سعیدی چند ثانیے سانس لینے کو رکا۔ میں دم بخود سا اس کے انکشاف پر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ مجھے خزانے وزانے جیسی خرافات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''عنقریب ممبئی میں ہی ٹکٹوں کی ایک بین الاقوامی نمائش ہو رہی ہے، وہاں مختلف ممالک سے ٹکٹوں کے ماہرین بھی آئیں گے، میں ان ماہرین سے ٹکٹوں کے بارے میں ان کی رائے دریافت کرنے کی کوشش کروں گا، اگر انہوں نے ٹکٹوں کی قیمت میری پیشکش سے زیادہ بتائی تو میں تمہیں مزید رقم کا چیک دوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''جمال گڑھ سے ممبئی کا یہ سفر فضائی ہوگا یا..؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔ مزید رقم ملنے کے تصور نے مجھے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔

''بائی روڈ...... ہم دونوں کار سے چلیں گے۔'' نواب سعیدی بولا۔ ''ممبئی میں تین دن تم میرے مہمان ہو گے اس کے بعد تم جہاں جانا چاہو چلے جانا، میں واپس جمال گڑھ لوٹ آؤں گا...... کیوں ٹھیک ہے نا......؟'' اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے یہ پروگرام پسند نہ آیا، تاہم میں نے بادل نخواستہ قبول کر لیا۔

وہ رات میں نے نواب عارف سعیدی کے محل ہی میں گزاری۔ اس نے مجھے ہوٹل نہیں جانے دیا تھا۔ ہم ماضی کی باتیں لے کر بیٹھ گئے، اسکول کے زمانے کی باتیں! بچپن کی شوخیاں اور بیتی زندگی کے واقعات دہرانے میں وقت گزر گیا، اس دوران رباطہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ وہ ہماری باتیں سن کر مسکراتی رہی، پھر جب رات زیادہ ڈھلنے لگی اور نیند نے غلبہ پانا شروع کیا تو بستروں کا رخ کیا۔

نواب عارف سعیدی واقعی بہت اچھا دوست ثابت ہوا تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اس سے پہلے کیوں نہ ملا۔

☆......☆......☆

پہر رات گزر چکی تھی۔

میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میری آنکھ کسی کھٹکے کی آواز پر کھلی تھی۔ یہ نواب سعیدی کی خواب گاہ تھی۔ اس نے بے حد اصرار کے ساتھ مجھے یہاں سلایا تھا اور وہ خود دوسرے کمرے میں جا سویا تھا۔ خواب گاہ میں سناٹا طاری تھا، تاریکی کی وجہ سے مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

معاً میری نگاہ خواب گاہ کے باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر جم گئی۔ باہر چاندنی میں کھڑکی کے شیشے کے پار مجھے کسی کا سایہ متحرک نظر آیا، پھر دوسرے ہی لمحے کھڑکی کا پٹ کھلا اور ایک ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنی گرفت جمانے لگا، اس کے بعد دوسرے ہاتھ میں مجھے ریوالور کی جھلک دکھائی دی تھی۔

میں نے اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال لیا اور پھر بے آواز مسہری کے نیچے رینگ گیا۔ نیند کا خمار کافور ہو چکا تھا، میں خطرہ بھانپ چکا تھا۔

کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کرنے والا یہ ریوالور بدست شخص یقیناً اچھی نیت سے نہیں آیا تھا اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ نواب سعیدی کو ہی قتل کرنے کے ارادے سے اس کی خواب گاہ میں چوروں کی طرح داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر نائیلون کا نقاب چڑھا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو چکا تھا، میں مسہری کے نیچے سے بھی اسے اپنی نظروں میں لیے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس نیت سے آیا تھا، چوری مقصد تھا یا قتل......؟ ساتھ ہی مجھے یہ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ یہ مسلح آدمیوں کے پہرے میں ریاست کے ایک نواب کے محل اور پھر خواب گاہ تک کیسے پہنچ گیا تھا؟

معاً میں نے دیکھا اس نقاب پوش ریوالور بدست شخص نے اپنے ریوالور کی خوفناک نال کا رخ مسہری کی جانب کر کے تین فائر کر ڈالے۔ فائرنگ کی آواز خواب گاہ کی در و دیوار کے محدود ماحول میں گونجی۔

اب مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً نواب کو قتل کرنے کے ارادے سے اندر داخل ہوا تھا۔ میں اس خیال سے ہی لرز اٹھا تھا کہ اگر میری بروقت آنکھ نہ کھلتی تو یہ نامعلوم قاتل مجھے نواب عارف سمجھ کر قتل کر چکا ہوتا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ نواب سعیدی یہاں نہیں سویا تھا، کیا خبر اس کی آنکھ نہ کھلتی...... تینوں گولیاں لحاف میں پیوست ہو چکی تھیں۔

جب گولیوں کے تین دھماکے ہونے کے باوجود نواب کے چیخنے کی آواز نہ ابھری تو میں نے مسہری کے نیچے سے اسے ٹھٹکتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے مسہری کی طرف بڑھتے دیکھا تو میں نے اس پر فائر جھونک دیا۔

ایک لرزہ خیز چیخ ابھری اور وہ نامعلوم شخص زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ میں فوراً مسہری کے نیچے سے نکلا۔

نواب سعیدی اور رباطہ بھی بیدار ہو کر وہاں آن موجود ہوئے۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ لاش کا جائزہ لیا گیا۔ میری گولی اس کا حلق ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ دونوں میاں، بیوی کا چہرہ فق تھا۔

پھر نقاب پوش کے چہرے سے نقاب اتارا گیا۔ میرے لیے تو وہ اجنبی تھا مگر نواب عارف سعیدی بھی اسے نہ پہچان سکا تھا۔ قرائن سے پتا لگتا تھا کہ وہ کوئی کرائے کا قاتل تھا جسے یقیناً نواب سعیدی کے کسی دشمن نے اسے ختم کرنے کی ذمے داری سونپی تھی۔

☆......☆......☆

وہ ساری رات جاگتے اور باتیں کرتے ہوئے گزر گئی۔ محل کے چوکیدار بے ہوش پائے گئے، انہیں ہوش میں لانے کے لیے خاصی دیر ہو گئی۔ ہوش میں آنے کے باوجود وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر رہے کہ آخر انہیں ہوا کیا تھا۔ میرے لیے یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ نواب سعیدی نے اس واقعہ کا کوئی خاص اثر نہ لیا تھا مگر رباطہ بہت فکرمند اور پریشان تھی۔ بعد میں نواب سعیدی نے مجھے تفصیل بتائی جس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ حرکت دیواس کھنہ ہی کی تھی، اسی نے اس شخص کو اُس کے قتل پر مامور کیا تھا۔

☆......☆......☆

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد نواب مجھے اپنی نئی مرسیڈیز میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے خود ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔ جب گاڑی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی، میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی تیز رفتار ڈرائیونگ کا عادی تھا۔

جمال گڑھ کی وادی سے نکلتے ہی پر پیچ پہاڑی راستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے کئی بار تیز رفتاری پر اسے ٹوکا بھی اور گاڑی آہستہ چلانے کی درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ وہ بہت تنگ، ناہموار اور پر پیچ پہاڑی راستوں پر اس طرح خطرناک ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے کار کی بجائے ہوائی جہاز اڑا رہا ہو۔ بریک اور گیئر تو جیسے کار میں تھے ہی نہیں...... کار طوفانی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔

ایک موقع پر جیسے ہی نواب عارف سعیدی نے موڑ کاٹا تو میری نگاہ اس ٹرک پر پڑی جو سڑک کے بیچوں بیچ اس طرح کھڑا تھا کہ راستہ بالکل بند ہو گیا تھا، شاید نواب سعیدی کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی، وہ دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

میں نے نواب سعیدی کو ٹرک کی موجودگی سے خبردار کرنا چاہا مگر اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، مرسیڈیز پلک جھپکتے میں اس ٹرک سے جا ٹکرائی۔ میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور مرسیڈیز کا اگلا حصہ بری طرح پچک گیا۔ ٹرک خالی تھا، ٹکر لگتے ہی لڑھکا اور سڑک کی ریلنگ توڑتا ہوا ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا گرا۔ اس وقت پہاڑی سے چند بڑے بڑے پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آنے لگے اور سیدھے نواب سعیدی کی کار کی چھت پر آ گرے۔ بھاری پتھروں نے کار کی چھت کو پچکا کر نشستوں سے ملا دیا مگر میں اس سے پہلے ہی کار کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا چکا تھا لیکن میں جیسے ہی کار سے باہر سڑک پر گرا، ایک پتھر سے میرا سر ٹکرایا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

جانے کب تک میں بے ہوش رہا۔ آنکھ کھلی تو میں مرسیڈیز کی طرف کھسکا۔ کیا دیکھتا ہوں نواب عارف سعیدی کا سر اسٹیئرنگ پر ٹکا ہوا تھا اور منہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی تھا یا نہیں......! وہ مجھے بے حس و حرکت نظر آ رہا تھا۔ خود میں بھی زخمی تھا۔ میرا سر، گردن اور شانے زخمی تھے، ان زخموں سے خون بہہ کر میری سفید شرٹ کو سرخ بنا رہا تھا۔

میں نے غمناک نظروں سے نواب کو دیکھا۔ کاش! وہ میری بات مان لیتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔ کار کی پچکی ہوئی چھت اور دبی ہوئی نشست کے بیچ اس کا جسم بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی، اب میرے کرنے کے لیے کچھ باقی نہ بچا تھا۔

مجھے سب سے پہلے جو فکر لاحق ہوئی، وہ یہ تھی کہ کسی طرح کار کے اندر سے اپنا بریف کیس نکال لوں جس کے اندر میرے نام کا پچاس لاکھ کا چیک موجود تھا تاکہ میں اسے دکھا کر رباطہ سے اپنے ٹکٹ واپس لے لوں کیونکہ ظاہر ہے مردہ آدمی کا چیک ردی کے پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ نواب عارف سعیدی کے مرنے کے بعد وہ چیک میرے لیے بیکار تھا، بینک اسے قبول نہیں کرتا۔

میں بمشکل اٹھا تو مجھے چکر آ گیا۔ بے اختیار میرے حلق سے کراہیں خارج ہو گئیں۔ میں بھی کچھ کم زخمی نہیں ہوا تھا، تاہم میں بہ دقت رینگنے کے سے انداز میں کار کے قریب پہنچا، پھر اندر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بریف کیس کار کے اندر نہ تھا۔ میں نے سوچا شاید جب کار ٹرک سے ٹکرائی تھی تو بریف کیس اس میں سے اچھل کر باہر جا پڑا ہو گا۔ میں نے پاگلوں کی طرح کار کے ارد گرد بریف کیس تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

بریف کیس غائب پا کر مجھ پر بدحواسی طاری ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، چیک کی غیر موجودگی میں میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ میں نے نواب عارف سعیدی کو ٹکٹ فروخت کیے تھے اور وہ میرا مقروض تھا، پچاس لاکھ کا مقروض......! اب یہ رباطہ کی نیک نیتی پر منحصر تھا کہ وہ چاہتی تو ٹکٹ مجھے لوٹا سکتی تھی، وہ صاف مکر بھی سکتی تھی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں بھلا میں اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

میں نے بدحواسی میں وہ کام کر ڈالا جو مجھے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر پڑے مردہ نواب عارف سعیدی کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے مجھے ایک لفافہ ملا، میں نے اسے کھولا اس میں وہی نیلے رنگ کا ٹکٹ رکھا ہوا تھا جس پر باریک اور چھوٹی بڑی لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے اپنی جیب میں رکھ لیا، باقی ٹکٹ اس کے پاس نہیں تھے، جس کا مطلب تھا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ممبئی میں ٹکٹوں کے بین الاقوامی ماہرین کو میرے ٹکٹوں کا ذخیرہ دکھائے گا اور اگر انہوں نے ان ٹکٹوں کی قیمت زیادہ بتائی تو وہ مجھے مزید رقم دے گا مگر اس کے پاس وہ ٹکٹ تھے ہی نہیں تو وہ ممبئی میں ان ماہرین کو کیا دکھاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس معاملے میں اس نے مجھے فریب دیا تھا۔

شاید وہ غیر محسوس طور پر میری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اگر ایسی بات تھی تو وہ مجھے پہلے ہی بھاری رقم کی پیشکش کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی، پھر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ نیلے رنگ کا ٹکٹ اس کی جیب میں کیوں تھا، وہ صرف یہی نیلے رنگ والا ٹکٹ جیب میں ڈال کر ممبئی کیوں جا رہا تھا۔ میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ اس کی تمام تر توجہ اور دلچسپی کا مرکز یہی نیلے رنگ کا ٹکٹ تھا، آخر کیوں......؟ میں نے مزید سوچنا چاہا مگر میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، میرے ذہن میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں بیہوش ہو گیا مگر بیہوش ہوتے ہوتے میں نے دو انسانوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تھا، ان میں ایک مرد اور دوسری عورت تھی۔ مرد میرے لیے اجنبی تھا، البتہ عورت میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی، وہ میرے لیے اجنبی نہ تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے ہوٹل میں ملی تھی اور جس نے مجھ سے نواب عارف سعیدی کے بارے میں متعدد سوال پوچھے تھے۔

جانے کتنی دیر بعد میں دوبارہ ہوش میں آیا تھا لیکن جب ہوش میں آیا تو میں نے اپنے گرد پولیس، ڈاکٹر اور نرسوں کے علاوہ چند اجنبی چہرے بھی دیکھے۔ یہ لوگ میرے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ان کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گویا حادثے کے فوراً بعد ہی مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

انسپکٹر پولیس مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر میرے اوپر جھک گیا۔ وہ میرا بیان لینا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر نے اسے روک دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی میری حالت بیان دینے کے قابل نہیں ہے۔ ''ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔'' پولیس انسپکٹر پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''میں کل صبح اس کا بیان لے لوں گا۔''

یہ بھی ایک مصیبت تھی۔ انسپکٹر کے تیور مجھے اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اب میں خود کو کوسنے لگا کہ کاش میں نے لالچ نہ کیا ہوتا اور آرام و سکون سے اپنی دکانداری میں مصروف رہتا مگر میں کیا کرتا، میرا کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ اب کیا فائدہ تھا پچھتانے کا، تاہم میں نے دل ہی دل میں اس بات پر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا کہ عارضی طور پر سہی اس نے مجھے انسپکٹر سے بچا لیا تھا۔

یوں بھی اس وقت میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس کے سوالات کے جوابات دے سکتا۔

پولیس اور ڈاکٹروں کے جانے کے بعد اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو نرسیں اسٹریچر پر ایک زخمی شخص کو ڈالے اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے مریض کو میری داہنی طرف کے ایک خالی بیڈ پر لٹا دیا۔ یہ شخص بری طرح زخمی تھا۔ اس کا چہرہ، بازو اور سینہ پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا اور ان پر خون لگا ہوا تھا۔

جب مریض کو میرے برابر والے بیڈ پر لٹا دیا گیا تو میں نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھی تو وہ مجھے شناسا سا لگا تب میں بری طرح چونکا۔ وہ ہوٹل کا منیجر پیڈرو تھا۔ اس ہوٹل کا مالک جس میں، میں نے قیام کیا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہوش میں تھا اور بستر پر چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

''لو سگریٹ پیو!'' میں نے اسے مخاطب کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، شاید اس نے میری بات نہیں سنی تھی۔

میں نے دوبارہ اسے آواز دی مگر اس مرتبہ بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے شاید پہچان نہ پایا تھا مگر میں تو اسے پہچان گیا تھا۔

میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی توجہ اپنے زخموں کی طرف سے ہٹ جائے۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں وہ مجھ سے میرے زخموں کے بارے میں نہ پوچھ بیٹھے۔ اگر وہ اس بارے میں کوئی سوال کرتا تو مجھے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہوا، ایک اتفاقی حادثہ نہیں تھا، اس حادثے کے پیچھے خاص عوامل کارفرما تھے تاہم میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس حادثے میں کس کا ہاتھ تھا، نیز اس کا مقصد کیا تھا۔

''پیڈرو......! تم کیسے زخمی ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا حادثہ رونما ہوا ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے کچھ کہے بغیر نفی میں سر ہلایا۔

میں چونکا، پھر پوچھا۔ ''تو کیا کسی نے تم پر حملہ کیا تھا؟''

''ہاں!'' اس بار وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''کون تھا، کس نے حملہ کیا تھا تم پر......؟''

وہ پہلے چند ثانیے چپ رہا پھر بمشکل باریک سی آواز میں بولا۔ ''تمہیں وہ لڑکی یاد ہو گی جس نے ہوٹل میں تم سے نواب عارف سعیدی کے بارے میں سوالات کیے تھے؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کے ایک ساتھی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔'' اس کی آواز میں غصے کی تپش تھی۔ ''مگر میں ان دونوں کو نہیں چھوڑوں گا، بدلہ لے کر رہوں گا۔'' وہ مزید تفصیل میں جانے کے موڈ میں تھا مگر زخموں سے اٹھنے والی ٹیسوں کے باعث وہ ہانپ کر رہ گیا پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ شاید وہ بیہوش ہو چکا تھا۔

وہ بے چارا رات بھر بستر پر پڑا کراہتا رہا، اس کے حلق سے مسلسل بے معنی آوازیں برآمد ہوتی رہیں جو ہلکی ہلکی غراہٹ سے مشابہ تھیں۔ اسے لڑکی اور اس کے ساتھی پر بری طرح طیش آ رہا تھا۔ باوجود کوشش کہ میں اس کے منہ سے نکلنے والے بے ربط جملوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی تھی جو باعث تشویش تھی۔ میں اپنے زخموں کو بھلا کر اس کے بارے میں سوچنے لگا اور رات بھر سو نہ سکا تھا۔ صبح ہونے سے قبل وہ بے چارہ دم توڑ چکا تھا اور یہ پراسرار راز بھی ہمیشہ کے لیے اس کے سینے میں دفن ہو کر رہ گیا کہ اس پر قاتلانہ حملہ کیوں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے روز صبح میں کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے سگریٹ کی طلب ہوئی تھی، سگریٹ تو مل گئی مگر میں یہ دیکھ کر سناٹے میں آ گیا کہ میری جیب سے وہ لفافہ غائب تھا جو میں نے نواب عارف سعیدی کی جیب سے نکالا تھا اور بقول اس کے یہ ایک نایاب ٹکٹ تھا جس پر کروڑوں ڈالر کی مالیت کے خزانے کا نقشہ درج تھا۔

میں نے اپنی ساری جیبیں دیکھ ڈالیں مگر لفافہ ہوتا تو ملتا جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے وہ لفافہ اپنی اوپر کی جیب میں ہی رکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ لفافہ کہاں گیا اور کس نے اڑایا۔

میں پریشان ہو گیا۔ ذہن میں بری طرح ہلچل ہونے لگی تب اچانک مجھے یاد آیا کہ حادثے کے باعث جب میں بے ہوش ہونے والا تھا تو میں نے ایک مرد اور عورت کو خود پر جھکتے دیکھا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بیش قیمت ٹکٹ والا لفافہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے اڑایا ہو گا لیکن کیوں......؟ اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو پولیس والے اندر داخل ہوئے اور میرے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے۔

''اٹھو تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔'' ایک نے میرے زخمی شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ میں کراہ کر رہ گیا۔ لہجہ انتہائی درشت تھا۔ مجھے یہ منکر نکیر ہی لگتے تھے جنہیں پولیس چیف نے بھیجا تھا۔ ان سے میں کسی طور چھٹکارا نہیں پا سکتا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ ان کے ہمراہ ہو لیا۔

وہ دونوں مجھے ریاست جمال گڑھ کے پولیس انسپکٹر کے کمرے میں لے گئے۔ انسپکٹر ایک لمبا تڑنگا، ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ نیکی کا منکر تھا۔ اس کا نام بعد میں انسپکٹر ڈھونگ راج معلوم ہوا۔ مجھے وہ خود سرتاپا ڈھونگ دکھائی دے رہا تھا۔ جمال گڑھ کا یہ انسپکٹر بڑی جلدی معمولی معمولی باتوں پر طیش میں آ جاتا تھا۔ غصے کی حالت میں ہر شخص کو بھنبھوڑنے کے لیے لپک پڑتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پولیس انسپکٹر ڈھونگ راج کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ اس نے مجھے اپنے سامنے والی ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

پھر اس نے اپنا پیڈ اٹھایا اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ اس کے بعد تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں کون ہوں، کیوں ہوں، کہاں پیدا ہوا؟ اس کا بس چلتا تو یہ بھی پوچھ بیٹھتا کہ کیوں پیدا ہوا۔

عمر، پتا، جمال گڑھ میں کیوں وارد ہوا، کب آیا اور ممبئی میں کیا کرتا تھا۔ سوالوں کی توپ داغنے اور میری طرف سے جوابی حملے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے جوابات سے مطمئن نہیں ہوا۔

''اچھا تو تم ٹکٹ فروش ہو؟'' اس نے مجھے گھورا۔ میں نے اثباتی جنبش دی۔

''نواب سے کب سے واقفیت ہے اور یہ شناسائی کب اور کیسے ہوئی......؟'' وہ بدستور برماتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے سوالوں کا جواب خاصی صراحت سے دیا۔ پھر یہ سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا۔ مثلاً میرا قیام کہاں تھا، ممبئی میں کہاں کس جگہ رہتا تھا، ڈرائیونگ لائسنس ہے یا نہیں، شناختی کارڈ کب اور کہاں بنوایا تھا۔ اس نے زیادہ تر اس بات پر زور دیا کہ نواب کے ساتھ میں کیوں سفر کر رہا تھا۔ علیحدہ گاڑی کیوں نہیں لی۔ مجھے ان سوالوں سے اب جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی مگر میں اس کا اظہار کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور بڑے تحمل کے ساتھ مناسب تفصیل دیتا رہا۔ سوالوں کے دوران قلیل توقف ہوا تو اس نے مجھے سگریٹ پیش کی اور خود دھواں اگلتے ہوئے بولا۔ ''ہاں اب یہ بتاؤ کہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟'' اس کی تیز برماتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

میں نے تمام واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور پھر بولا۔ ''اس وقت کار کی رفتار ایک سو بیس میل فی گھنٹہ تھی اور میرے بار بار کے ٹوکنے کے باوجود......!''

اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔ ''اچھا...... اچھا! تمہیں اتنی رفتار کا کیسے علم ہوا؟'' بڑا عجیب سوال تھا اور بڑے مشتبہ انداز میں پوچھا گیا تھا۔

''میری نظریں بار بار اسپیڈومیٹر کی سوئی پر پڑ رہی تھیں جو میری آنکھوں کے سامنے تھا۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''حالانکہ موڑ پر نواب عارف سعیدی نے بریک لگانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی کار بے قابو ہو کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ٹرک سے جا ٹکرائی۔''

اس کا تفتیش کرنے کا انداز بالکل روایتی پولیس والوں جیسا تھا جس سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ مجھے اب اس خرانٹ پولیس انسپکٹر سے ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں یہ مجھ پر تشدد نہ کرنا شروع کر دے۔

''بھلا یہ کیسے ممکن ہوا کہ حادثے کے وقت پر تم تو اوپر رہے اور نواب عارف سعیدی مع کار نیچے دب گیا؟'' اس نے پوچھا۔ میں بغلیں جھانکنے لگا۔ بھلا میں کیا جواب دیتا۔ چند لمحوں بعد میں نے ذرا ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ ''میرا وہ بریف کیس کہاں گیا جو نواب عارف سعیدی کی کار میں رکھا ہوا تھا؟''

''تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے، میرے سوال کا جواب دو۔'' وہ درشتی سے غرایا۔

''حادثہ ہوتے ہی میں اچھل کر گاڑی سے باہر جا گرا تھا۔'' میں نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

''جا گرے تھے یا خود باہر نکل گئے تھے؟'' انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! میں خود بخود اچھل کر باہر جا گرا تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''حادثے کے فوراً بعد کسی نے جمال گڑھ کے اسپتال میں جائے حادثہ پر ایمبولینس بھیجنے کی درخواست کی تھی؟'' اس نے انکشاف کیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ حادثے کے بعد تم پیدل دو میل دور ایک گاؤں تک پہنچے، وہاں سے اسپتال میں ایمبولینس بھیجنے کے لیے فون کیا پھر خود جا کر جائے حادثہ پر لیٹ گئے تاکہ کسی کو تم پر شبہ نہ ہو سکے؟''

''شبہ......؟'' میں حیران ہوا۔ ''نہیں! یہ غلط ہے، میں تو اسی وقت بے ہوش ہو چکا تھا۔'' میں نے تردید کی۔

پولیس انسپکٹر ڈھونگ راج کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے حادثے کا ذمہ دار گردانے پر تلا ہوا تھا۔ شاید وہ مجھے نواب عارف سعیدی کو قتل کرنے کی سازش کا ماسٹر مائنڈ سمجھے ہوئے تھا جس نے خود کو بچانے کی غرض سے حادثے کا رنگ دے دیا تھا لہٰذا وہ مجھے گھورتا ہوا پُریقین لہجے میں بولا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا ورنہ پھر حادثے کے بارے میں پولیس کو فون کس نے کیا تھا اور اسپتال سے ایمبولینس بھجوانے کی درخواست کس نے کی تھی؟''

میں پولیس انسپکٹر کے حتمی فیصلے پر گھبرا گیا تھا۔ اس نے شاید طے کر لیا تھا کہ میں اصل مجرم ہوں۔ وہ غالباً حادثے کے ذمے دار افراد کی تلاش کی دردسری مول لینا نہیں چاہتا تھا اور ہر صورت میں مجھے تختہ دار پر لٹکانا چاہتا تھا۔ اب میں دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا کہ مجھے خواہ مخواہ ہی ٹکٹ فروش بننے کا شوق چرایا تھا، میں ایک خطرناک مصیبت کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی بات تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آنے لگا کہ حادثے کے فوراً بعد جب میں سڑک پر گرا تھا تو بے ہوش ہونے سے قبل میں نے ایک کار کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا جسے ایک عورت چلا رہی تھی۔ اس نے گوریلا فوجیوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ حادثے اور خون کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے میری تلاشی لیتے ہوئے مجھ سے کچھ پوچھا تھا مگر میں فوراً ہی بیہوش ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی عورت نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں حادثے کی اطلاع دی ہو یا پھر ایمبولینس کے لیے اسپتال فون کر دیا ہو۔

میں نے یہ بات انسپکٹر راج کو بتا دی۔ وہ میری بات سن کر الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی کہ وہ اب بھی میرے بیان سے مطمئن نہ ہوا تھا اور اشتباہ آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگا تھا۔

''مجھے امید ہے کہ نواب عارف سعیدی کا بریف کیس تمہیں مل گیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ ہنوز مجھے گھورے جا رہا تھا۔ اس نے پتا نہیں میرا سوال سنا بھی تھا یا نہیں! یا دانستہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔ ''تم نواب سعیدی کے ساتھ سفر کیوں کر رہے تھے؟''

''ممبئی میں قدیم ٹکٹوں کی بین الاقوامی نمائش لگی ہوئی تھی، نواب سعیدی اسے دکھانے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔''

''کوئی دوسری وجہ......؟'' وہ پھنکارا۔

''ایک وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ٹکٹوں کا سودا کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے متردد لہجے میں کہا۔ ''نواب عارف سعیدی کے بریف کیس میں میرے دیے ہوئے لاکھوں مالیت کے ٹکٹ موجود تھے، نواب نے یہ بریف کیس میرے سامنے ہی کار میں رکھا تھا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' پولیس انسپکٹر نے برہمی سے کہا۔ ''کیونکہ ہمیں جائے حادثے پر کوئی بریف کیس نہیں ملا۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ میں اس کی بات پر اندر ہی اندر بھنا گیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے موجودہ صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ وہ عورت وہاں کیسے پہنچ گئی یا یہ محض ایک اتفاق تھا، کیا وہ بریف کیس اڑانے کے لیے وہاں پہنچی تھی مگر اسے یہ کیسے علم ہوا کہ نواب کے بریف کیس میں لاکھوں مالیت کے ٹکٹ موجود ہیں۔

بہر طور یہ بات واضح تھی کہ نواب عارف سعیدی کو جان بوجھ کر قتل کیا گیا تھا۔ سڑک کے وسط میں ٹرک کا کھڑا ہونا، پہاڑ پر سے بھاری پتھروں کی بارش جس نے کار کی چھت پچکا دی تھی۔ یہ ساری باتیں کسی منصوبہ بندی ہی کی غماز تھیں۔

''تم کسی بریف کیس کا تذکرہ کر رہے تھے مگر یہ سچی بات ہے کہ حادثے کی جگہ بریف کیس پولیس کو نہیں ملا۔'' انسپکٹر راج نے مجھے چونکا دیا۔ ''تم مجھے اس بریف کیس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

میں نے مختصراً بریف کیس کی رنگت، ساخت اور سائز کے بارے میں بتایا۔ انسپکٹر اس تفصیل کو سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر ان گنت لکیروں کا جال سا بن گیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں نظر آنے لگا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالی اور سلگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ یہ عین ممکن تھا کہ میرے دیے ہوئے قیمتی اور نایاب ٹکٹوں کا علم کسی کو نہ ہوا ہو اور ٹکٹوں کی چوری کی بجائے نواب عارف سعیدی کے قتل کی وجہ یا محرک کچھ اور ہو۔

''تم نے خود کو ٹکٹ فروش بتایا ہے لیکن میری معلومات کے مطابق تم ملٹری سیکریٹ سروس میں بھی رہ چکے ہو اور اسپیشل ایجنٹ کی حیثیت سے تم نے چھ ماہ افریقہ میں بھی گزارے ہیں، پھر کسی ناقابل تلافی غلطی کی پاداش میں تمہیں نوکری سے نہ صرف برطرف کر دیا گیا بلکہ ٹرائل بھی ہوا، اس کے بعد تم نے ممبئی میں ایک اسٹور لیا جس میں کھلونے اور اسپورٹس سے متعلق سامان فروخت ہوتا ہے۔'' وہ گرجا۔ ''آخر اس غلط بیانی کا مقصد کیا ہے تمہارا......؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میری گزشتہ زندگی کا تعلق اس حادثے سے کیوں جوڑا جا رہا ہے؟'' میں نے پہلی بار ناگواری ظاہر کی۔

''حادثہ......؟'' وہ خونخوار لہجے میں غرایا۔

''یہ حادثہ نہیں تھا، ہمیں جائے واردات پر ونچسٹر رائفل کا ایک کارتوس بھی ملا تھا، یہ کارتوس ڈرائیونگ سیٹ میں دھنسا ہوا تھا، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے نواب کا نشانہ لے کر گولی چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔''

(جاری ہے)

شاطر کھلاڑی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط : 3

''میرے پاس تو کوئی رائفل نہیں تھی؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''اگر ہوتی بھی تو میں اسے بھلا کار کے اندر کس طرح استعمال کرسکتا تھا؟''

یہ میرے لیے حیران کن انکشاف تھا۔ میں نے رائفل کے دھماکے کی آواز نہ سنی تھی۔ ممکن ہے رائفل عین اس وقت چلائی گئی ہو جب کار ٹرک سے ٹکرائی تھی اور اس دھماکے میں اس کی آواز دب گئی ہو جسے میں نہ سن سکا تھا۔

''بے شک! تم ایسا نہیں کرسکتے تھے۔'' انسپکٹر ڈھونگ راج پہلی بار میری کسی بات سے متفق ہوا۔ پھر آگے بولا۔ ''مگر تمہارے مشتبہ دوست تو ایسا کرسکتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ نواب کے قتل کے لیے کرائے کے قاتلوں کی خدمات حاصل کی گئی ہوں؟''

اس کا لہجہ بڑا معنی خیز ہوگیا۔ میں لرز اٹھا۔

''کیا تم مجھ پر الزام عائد کررہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''پھر مجھے خاموش رہنا چاہیے تاوقتیکہ میں کوئی وکیل نہ کرلوں اور وہ مجھ سے آکر مل نہیں لیتا۔''

''کوئی وکیل کچھ نہیں کرسکتا۔'' انسپکٹر راج طنزیہ انداز میں ہنس کر بولا۔ ''یہ ریاست جمال گڑھ ہے۔ یہاں کا قانون وہ ہے جو میرے منہ سے نکلے۔'' اتنا کہہ کر اس نے میز کی نچلی دراز کھولی اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے فوٹو پر نگاہ ڈالی اور نفی میں گردن ہلادی۔ ''کون ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔ تصویر میں موجود چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

''یہ انتہائی بدکردار اور مشکوک آدمی ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس کا نام رائے گوپال ہے اور یہ نواب سعیدی کا ڈرائیور تھا مگر کچھ عرصے پہلے ملازمت چھوڑ کر جاچکا ہے۔''

میں اس نام سے واقف تھا۔ اس کا شمار انڈر ورلڈ کے ماہر نشانچیوں میں ہوتا تھا مگر میں الٹی آنتیں گلے پڑنے کے مصداق اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم ذرا آرام کرلو، لیکن سنو۔'' اس نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''تمہارے لیے بہتری اس میں ہوگی کہ مجھے صاف صاف بتادو، ورنہ تمہارا انجام بہت بھیانک اور لرزہ خیز ہوسکتا ہے۔''

میرے سینے میں سانس اٹکنے لگی۔ یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔

دو پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ راج نے انہیں اشارہ کیا۔ وہ دونوں مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور ایک گندی سیلن زدہ کوٹھری میں بند کردیا۔ یہاں ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ سڑاند سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔

o……o……o

میری حالت بتدریج غیر ہونے لگی۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ یوں پھنس جاؤں گا، وہ بھی بیگناہ۔ اپنے شہر سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی جگہ پر پولیس کے لاک اپ میں قید میری کیا حالت تھی، اس کا تصور میں ہی کرسکتا تھا۔

یہاں کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔ سوائے نواب سعیدی کے مگر میری یہ واقفیت جتنی معتبر اور مستند تھی، اس کے مرنے کے بعد اس سے زیادہ میرے گلے پڑ گئی تھی۔ اب مجھے نواب سعیدی کے قتل کے شبے میں قید کرلیا گیا تھا۔ اس پر مستزاد اس چنگیز خان ٹائپ پولیس آفیسر نے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔

میں کس سے مدد لیتا۔ بے بسی کے احساس تلے مجھ پر اداسی طاری ہونے لگی۔ یہاں میرے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوسکتا تھا۔ میں تاریک راہوں میں مارا جاتا تو کسی کو خبر نہ ہوتی؟

تنہائی میسر آئی تو میرے ذہن نے سوچنا شروع کیا۔ میں ازسرنو سارے حالات کا جائزہ لینے لگا۔

وہ لڑکی جو مجھے ہوٹل میں ملی تھی، آخر کیوں مجھ سے نواب سعیدی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی؟ کیا اُس کا اس حادثے اور نواب کی موت سے کوئی تعلق تھا۔

رائے گوپال، نواب کی ملازمت کیوں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور نواب نے اس کے بارے چھان بین کیے بغیر کیوں اسے اپنی ملازمت میں رکھا تھا؟

پیڈرو پر حملہ کیوں ہوا تھا؟

بریف کیس کہاں غائب ہوگیا تھا؟

پولیس انسپکٹر راج کو جائے حادثہ پر رائفل کا کارتوس کیسے ملا؟ کس نے چلائی تھی وہ گولی؟

جائے حادثہ پر میرے بے ہوش ہوجانے سے قبل میری تلاشی کس نے لی تھی اور کیوں؟ پھر پولیس کو حادثے کی اطلاع دینے والے کون تھے؟

ایسے ہی سوالوں نے بہ یک وقت میرے ذہن پر یلغار کی تھی اور میرے پاس ان میں کسی کا کوئی جواب نہ تھا۔ پھر یہ سوچ کر میرے رگ و پے میں خوف کی لہر سرایت کرگئی کہ انسپکٹر راج مجھے نواب سعیدی کا قاتل بنانے پر تلا بیٹھا تھا اور خود ساختہ زبردستی اقبال جرم کرانے کے لیے مجھ پر انسانیت سوز تشدد بھی کرسکتا تھا۔

ابھی اس الجھن آمیز پریشان کن سوچوں میں غلطاں تھا کہ معاً کوٹھری کا دروازہ کھلا۔

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ دروازے پر پولیس انسپکٹر راج کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''اسلم مہربانی کرکے میرے کمرے میں آجائیں۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''خلاف توقع اسکے لہجے کی نرمی نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔ شاید وہ مکاری دکھا رہا تھا۔ وہ تفتیش کا انداز بدلنا چاہتا تھا۔

خیر جو بھی تھا، میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو وہ بولا۔ ''تم اگر پہلے مجھے بتادیتے کہ نواب بیگم تمہیں جانتی ہیں تو تمہیں اتنے سخت مراحل سے نہ گزرنا پڑتا۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ تو ڈھونگ راج اس لیے مجھ پر مہربان ہوا تھا۔

''تو کیا عارف سعیدی کی بیوی رباطہ نے میری ضمانت دی ہے؟ مگر کیسے؟ کس طرح؟ کسے اس نے بھیجا تھا؟ اور اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں پولیس کے نرغے میں ہوں؟ میں کچھ ایسے ہی ناگفتہ دگرگوں حالات سے گزر رہا تھا کہ بس اب میرے پاس سوالوں اور الجھنوں کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔

میں انسپکٹر راج کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے وہاں نواب سعیدی کی بیوہ رباطہ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

رباطہ اب ریاست جمال گڑھ کی بے تاج ملکہ تھی۔ میں اسے یک ٹک تکے جارہا تھا۔ مجھے انسپکٹر راج کی نرم مزاجی اور دوستانہ سلوک کی وجہ بہ خوبی سمجھ آگئی تھی۔ رباطہ چند ثانیے بغور میرا جائزہ لیتی رہی، پھر بولی۔ ''اسلم! آپ کو چاہیے تھا کہ مجھے فون کردیتے۔ میں نے آپ کی طبیعت دریافت کرنے کے لیے اسپتال فون کیا تو وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ یہاں ہیں۔ مجبوراً مجھے یہاں آنا پڑا۔''

انسپکٹر راج فوراً بولا۔ ''مسٹر اسلم! نواب بیگم نے مجھے بتایا کہ آپ نگنوں کی فروخت کے سلسلے میں نواب مرحوم سے ملنے آئے تھے اور کار سے ممبئی جانے کا فیصلہ خود نواب نے کیا تھا۔''

اس کے لہجے میں ایک بار پھر معذرت عود کر آئی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ ''آپ آزاد ہیں۔''

رباطہ فوراً اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سیاہ لباس میں تھی اور اس کے چہرے سے ملال عیاں تھا۔ پولیس انسپکٹر راج اسے رخصت کرنے کے لیے عمارت کے بیرونی دروازے تک آیا۔

ہم دونوں پولیس ہیڈ کوارٹر سے باہر نکلے تو ایک باوردی ڈرائیور کار لیے ہمارا منتظر تھا۔ میں رباطہ کے ساتھ ہی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی کا انجن ہلکے سے غرایا اور گاڑی قلعہ نما محل کی طرف بڑھ گئی۔

رباطہ کا چہرہ اداس اور کھویا ہوا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ میں یہ دیکھ کر اس سے نواب کی موت پر تعزیت بھی نہ کرسکا لہٰذا خاموش رہا۔ یوں راستے بھر ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

محل میں داخل ہوتے ہی رباطہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اسلم صاحب! میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس کا تمہاری طرف سے مجھے کیا صلہ ملے گا؟'' اس کی آواز ہر قسم کے جذبے سے عاری تھی۔

''نواب بیگم!'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں آپ کا احسان مند ہوں۔ مجھے بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''بعد میں بتاؤں گی؟'' وہ مسکرائی۔ ''فی الحال تم میرے ساتھ ایک اہم میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

میں حیران ہوا مگر چپ رہا۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے، وہاں دو آدمی پہلے سے موجود تھے۔ وہ رباطہ کو دیکھتے ہی احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں ہی عمر رسیدہ تھے۔ ان میں سے ایک طویل قامت اور دبلا پتلا جبکہ دوسرا کوتاہ قد اور قدرے پھیلی ہوئی جسامت کا مالک تھا۔ وہ دونوں بہترین سوٹس میں ملبوس تھے۔ ان میں سے ایک پائپ پی رہا تھا اور دوسرا سگار۔

''یہ اسلم صاحب ہیں۔ نواب مرحوم کے دوست۔'' رباطہ نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ پھر میری طرف گھوم کر بولی۔ ''اور یہ مسٹر بابو کھرانہ ہیں، ہماری جاگیر کے نگراں۔''

اس نے طویل قامت شخص کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فربہی مائل آدمی کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔ ''یہ مسٹر عزیز باجوہ ہیں، ہمارے وکیل۔ نواب مرحوم ان دونوں پر بہت اعتماد کرتے تھے۔''

ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور دوستانہ انداز میں مسکرائے۔ پھر رباطہ کے اشارے پر دوبارہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میٹنگ شروع ہوگئی۔

بابو کھرانہ نے سب سے پہلے رباطہ کو جاگیر کی تفصیل اور اس کی موجودہ مالیت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد عزیز باجوہ نے رباطہ سے کہا۔ ''میں نے مختلف اکاؤنٹس کی جانچ پڑتال کی تھی۔ مرحوم کے نام مختلف بینکوں میں مختلف رقوم موجود ہیں۔ جمال گڑھ کے مقامی بینک میں نواب سعیدی کے کھاتے میں چھتیس کروڑ تھے۔ قانونی کاغذات کی تکمیل کے بعد میں نے بینک سے رقم نکلوا کر مسٹر کھرانہ کے حوالے کردی تھی۔''

اس کی بات سن کر جاگیر کے نگراں مسٹر کھرانہ نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ''جی ہاں! یہ رقم باجوہ صاحب کے توسط سے مجھے مل چکی ہے۔ میں نے خفیہ سیف میں رکھوا دی ہے۔''

''یہ مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔ اس میں سے تیس کروڑ کی رقم اس وقت آپ کے نام منتقل ہوجائے گی جب نواب کی موت کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور وراثت نامہ بینک میں جمع کرایا جائے گا۔''

''یہ کب تک ہوجائے گا؟'' رباطہ نے پوچھا۔

''دو تین ہفتے لگ جائیں گے۔'' باجوہ بولا۔ ''ممکن ہے تاخیر بھی ہوجائے۔''

''کیوں؟ اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے؟'' رباطہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''تاخیر ہمارے لیے مسائل کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ سارے کام جتنی جلدی ہوجائیں، اتنا ہی بہتر ہیں۔''

''جی ہاں! ایک دو بینک ممبئی میں بھی ہیں۔ ان میں رقوم موجود ہیں مگر وہ زیادہ نہیں ہیں۔'' باجوہ نے بتایا۔ ''نیو دہلی کے ایک دو بینکوں میں نواب مرحوم کے نام سے رقوم جمع ہیں لیکن انہیں نکلوانے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ ممکن ہے بعض کاغذی کارروائیوں کی تکمیل کے سلسلے میں خود مجھے نیو دہلی جانا پڑے۔ میری معلومات کے مطابق نیو دہلی کے بینکوں میں پانچ، سات کروڑ ہوں گے۔''

''بس کل یہی رقم؟ آگے کیا ہوگا؟'' کھرانہ نے گھبرا کر کہا۔

اس پر باجوہ نے سامنے موجود بڑی سی میز کی طرف دیکھا، جس کی قیمت کسی بھی طرح چار لاکھ سے کم نہ تھی۔ وہ خالص چاندی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ کھرانہ میز کو یوں گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو، یہ فروخت کرکے مزید رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔

''ہم زمین فروخت کردیں گے!'' رباطہ نے کہا۔ ''اس میں کتنا وقت لگ جائے گا؟''

''زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔'' کھرانہ نے بتایا۔ اس کے بعد میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔

o……o……o

رات ہوچکی تھی۔ میں اس وقت رباطہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وسیع و عریض میز پر مختلف قسم کے کھانے سجے ہوئے تھے مگر کھانے والے ہم دو ہی تھے۔ چند باوردی ملازم خالی پلیٹیں ہمارے سامنے سے اٹھا رہے تھے جبکہ ایک ملازم بھری ہوئی پلیٹیں ہمارے آگے بڑھا رہا تھا۔

معاً رباطہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اسلم! میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا فیصلہ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ تم ایک اچھے اور قابل اعتماد آدمی ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ مجھے اس اعزاز سے نہ نوازیں۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ میں آپ کا بہتر رازدار نہ بن پاؤں اور آپ کے معیار پر پورا نہ اتروں؟''

وہ میری بات پر کان دھرے بغیر بولی۔ ''میں ممبئی جانا چاہتی ہوں۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''کچھ لوگ میرے اس سفر کے خلاف ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں ممبئی جاؤں۔ تم میرے ساتھ چلوگے۔ ضرورت پڑی تو اسلحے کا بے دریغ استعمال کرسکتے ہو۔''

مجھے اپنے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑنے کا احساس ہوا۔ تاہم بولا۔ ''مگر……؟'' جانے کیوں میں کہتے کہتے رکا۔

''پولیس انسپکٹر ڈھونگ راج کی بدبودار کوٹھری سے ممبئی بہر حال لاکھ درجے بہتر جگہ ہے۔'' مجھے اس کے لہجے میں کھلی تنبیہ محسوس ہوئی اور میں خود کو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا ہوا سمجھنے لگا۔

اس کے دھمکی آمیز لہجے نے مجھے ششدر کر ڈالا تھا۔ اس کے یک بہ یک بدلتے ہوئے تیوروں نے مجھے ساکت کردیا تھا۔

پھر اس کے ایک مخصوص اشارے پر اس کا ملازم ایک عدد جدید ساخت کا آٹومیٹک ریوالور لے آیا۔ وہ وزن میں ہلکا تھا مگر کارکردگی کے لحاظ سے قابل مثال تھا۔ رباطہ نے وہ ریوالور میرے ہاتھ میں تھما دیا جو مجھے انتہائی سرد لگا۔

''اب تم میرے محافظ ہو……ٹھیک؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''تمہیں اس خدمت کا معقول معاوضہ ملے گا۔''

''جبری خدمت کا؟'' میں نے دل ہی دل میں سلگ کر کہا۔

o……o……o

اگلے دن ہم دونوں ممبئی روانہ ہوگئے۔ میں بہ حیثیت ''محافظ'' رباطہ کے ہمراہ تھا۔

شام تک ہم جمال گڑھ کی ریاست کی حدود عبور کرچکے تھے اور اگلے دن غروب آفتاب سے قبل ممبئی میں داخل ہوگئے۔ میرے مشورے پر رباطہ نے ایک ہوٹل میں قیام کا ارادہ کرلیا۔ جمال گڑھ تک مجھے یہ خطرہ دامن گیر تھا کہ کہیں رباطہ کے نامعلوم دشمن ہمارا تعاقب نہ کررہے ہوں۔

سفر کے دوران دو جگہوں پر میں ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کئی بار مجھے یوں لگا تھا کہ اس کے نامعلوم دشمن ہماری کار کا تعاقب کررہے تھے، مگر جلد ہی میرا یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔ کوئی ہماری کار کا تعاقب نہیں کررہا تھا۔

اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں، جس کا انتخاب رباطہ نے کیا تھا۔ کھانے کی میز پر میں نے دوٹوک لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''بہتر ہوگا اب آپ اپنے لیے کوئی نیا محافظ تلاش کرلیں۔ ہم ممبئی پہنچ چکے ہیں۔''

میری بات سن کر وہ مسکرائی۔ ''مجھے محافظ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ یہاں تمہیں میرے لیے ایک وکیل کا کردار ادا کرنا ہوگا۔''

''میں……اور……وکیل؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے تو قانون کی الف بے تک نہیں آتی؟'' میرے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی عود کر آئی تھی۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ اسرار بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ''تمہیں دوران گفتگو بس ایک اکھڑ مزاج اور تندخو وکیل کی طرح بولنا ہوگا اور تم یہ کام بہ آسانی کرسکتے ہو۔''

میں خاموش ہوگیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اس طرح مجھے استعمال کرکے کیا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ ''تم آخر ممبئی کس مقصد کے لیے آئی ہو؟ یہاں کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''میں کیا کرنا چاہتی ہوں؟'' وہ عجیب لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولی۔ جانے کیوں اس کی پراسرار مسکراہٹ نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

اگر چہ میرے ذہن میں بہت سے ایسے سوالات تھے [illegible] ؟ اسے رقم کی ضرورت کیوں تھی؟ کس کے لیے تھی۔ یہ سوال میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

اس کے شوہر نواب سعیدی کو مرے زیادہ روز نہیں گزرے تھے۔ آخر پھر اسے رقم کی ضرورت کیوں تھی؟

ہوٹل میں رات گئے سونے سے پیشتر رباطہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔ ''اسلم! کیا تم چندی رام کو جانتے ہو؟''

''چندی رام؟'' میں نے بھنویں سکیڑیں۔ ''کون ہے یہ؟ میں تو نہیں جانتا۔''

اس نے مضطربانہ انداز میں سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور پُرکثیف دھواں کمرے کی محدود فضا میں اگلتے ہوئے بولی۔ ''وہ خود کو ایک وکیل کہتا ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے وہ چندی رام نامی آدمی سے خوف زدہ ہو۔ میرا یہ خیال جب زبان پر آیا تو وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''ہاں……شاید……کیوں کہ وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔''

میں نے رباطہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پھر پوچھا۔ ''تم اس سے خوف زدہ کیوں ہو؟''

اس نے جواباً ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہت لمبی کہانی ہے یہ……''

اتنا کہہ کر وہ پُرسوچ انداز میں خاموش ہوگئی۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اسے وضاحت پر مجبور کرنے کی غرض سے مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

تب اس نے صراحت بیان کرنا شروع کردی۔

''میں نے چندی رام کو نواب کے جنازے میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھا جب نواب کی لاش کو غسل دے کر آخری دیدار کے لیے محل کے دروازے پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں اس کا ذرا گہری نظروں سے جائزہ لیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ میں نے دیکھا وہ نواب کے تابوت کے قریب جا کھڑا ہوا جسے ریاست جمال گڑھ کے ایک ماہر اور بہترین کاریگر نے تیار کیا تھا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے ہمراہ دو افراد اور بھی تھے۔ وہ تینوں نہ جانے کیوں تابوت کا بغور معائنہ کررہے تھے، جیسے انہیں حیرت ہو۔ مگر میں خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی اور دوبارہ مضطربانہ انداز میں ایک طویل کش لیا اور دھواں فضا میں اگلا۔ وہ بری طرح اعصاب زدہ نظر آنے لگی۔

میں خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''میں یہ سمجھتی تھی کہ وہ تینوں شاید نواب کے کاروباری ساتھی ہوں گے مگر اس وقت میں یہ دیکھ کر چونکے بنا نہ رہ سکی کہ چندی رام کا ایک ساتھی ایک ستون کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کیوں کررہا تھا۔ وہ مجھے بشرے سے اچھے کردار کا آدمی نہیں محسوس ہوا تھا۔

بہرطور……تدفین وغیرہ کے بعد چندی رام تعزیت کے لیے میرے پاس آیا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام چندی رام ہے اور میں نواب عارف سعیدی کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ مجھے اس کی ناگہانی اور بے وقت موت پر دکھ ہے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔''

میں نے چندی رام کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے غم کے موقع پر شرکت کی۔

وہ خاصی دیر تک مرحوم نواب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہا۔ آخر میں بولا۔ ''غم کے اس موقع پر کاروباری گفتگو کرنا بے محل ہے……لیکن……میڈم! آپ مجھے اتنا بتائیں گی کہ آپ کو اپنے شوہر کے کاروبار کے بارے میں کتنا علم ہے؟''

مجھے اُس کا یہ سوال بڑا عجیب لگا تھا، تاہم میں نے کہا۔ ''کسی حد تک۔ مرحوم نواب اکثر مجھ سے اپنے کاروبار کے بارے میں کبھی تفصیلاً اور کبھی مختصر بات کرتے رہا کرتے تھے، کیا آپ مجھے یہ بتائیں گے……آپ کس حد تک میرے شوہر مرحوم کے بارے میں شریک رہے ہیں؟''

وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ سردست اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ بس، یوں سمجھ لیں کہ ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر تھے اور دونوں ہی مشترکہ جدوجہد کرتے تھے۔''

وہ قدرے رقت آمیز آواز میں بولا۔ ''مرحوم نواب کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا۔''

''مگر نواب نے کبھی مجھ سے آپ کے بارے میں ذکر نہیں کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''ہوسکتا ہے نہ کیا ہو۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

''ویسے کیا یہ درست ہے کہ کچھ عرصے سے آپ کے شوہر پریشان رہنے لگے تھے؟''

اس کے سوال کرنے کے انداز سے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کسی خاص مقصد کے لیے کرید رہا ہے یا کچھ میرے منہ سے اگلوانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے مستحکم اور محتاط لہجے میں کہا۔ ''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔''

''تو پھر نواب مرحوم محل میں محافظوں کا دستہ کیوں رکھتے تھے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے بھانپتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر مرکوز کردیں۔ ''میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ میز کی دراز میں ہمہ وقت ایک بھرا ہوا پستول رکھتے تھے۔''

''تمہارا خیال غلط ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ہم کیونکہ ایک نسبتاً ویران جگہ میں رہتے تھے اس لیے محافظ ہماری مجبوری تھے۔''

''ہوسکتا ہے یہ بات درست ہو۔'' چندی رام نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مگر میرے خیال میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرحوم نواب کسی پریشانی میں گھرے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھے۔ مگر افسوس……وہ خود کو بندوق کی نال سے دور نہ رکھ سکے۔ محافظوں کے دستے کے باوجود۔''

آخری الفاظ اس نے بڑے پراسرار انداز میں کہے تھے۔ جانے کیوں میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ بڑے عجیب انداز میں گفتگو کررہا تھا پھر میں نے اسے مکاری سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ دراصل آدمی کو ہتھیار بچا سکتے ہیں اور نہ ہی محافظوں کی پوری فوج۔''

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ میں نے اندر ہی اندر انجانے خوف کو محسوس کرنے کے باوجود یکدم درشت لہجے میں کہا۔ ''مسٹر چندی رام! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہاں تم اپنے دوست کی تعزیت کرنے آئے ہو یا اپنے دوست کی دکھی بیوہ کو دھمکیاں دینے؟'' میرے لہجے میں زہریلا طنز عود کر آیا تھا۔ ''مت بھولو کہ تم اس وقت نواب مرحوم کی بیوہ سے مخاطب ہو اور یہاں اجنبی ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں اسی وقت گرفتار بھی کرواسکتی ہوں۔''

''میری گرفتاری آسانی سے نگلنے والی نہیں۔ چھچھوندر کی طرح آپ کے حلق میں پھنس جاؤں گا میڈم! مجھے آپ اگل سکیں گی نہ نگل۔'' وہ سرد انداز میں مسکرایا۔ ''ویسے آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں دھمکیاں نہیں دے رہا بلکہ تصویر کا دوسرا رخ……جو صحیح ہے، دکھانا چاہتا ہوں۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ آپ کے شوہر کے قبضے میں ایک ایسی اہم شے ہے جو دراصل میرے دوستوں کی امانت میں شمار ہوتی ہے۔'' اس نے آخر میں جیسے دھمکایا۔

میں نے مرعوب ہوئے بغیر ناگواری سے کہا۔ ''اگر یہ بات تھی تو پھر دھمکیاں دینے کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے نہیں بتاسکتے تھے؟ میرے شوہر کے پاس اگر آپ کے دوستوں کی کوئی چیز امانتاً رکھی ہوگی تو وہ آپ کو مل جائے گی۔''

''مجھے خوشی ہوئی آپ کی اس بات پر میڈم۔'' وہ مکارانہ انداز میں بولا۔ اس کے چہرے پر یکدم بشاشت دوڑ گئی تھی۔ جیسے اسے امید ہوچلی تھی کہ اب ہمارے درمیان خوش اسلوبی سے یہ معاملہ طے پاجائے گا۔ وہ لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ''اوڈیسہ کے کچھ شیئرز تھے آپ کے شوہر کے پاس۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ انہوں نے کہاں رکھے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ کس بینک کے لاکر میں؟''

''مجھے اس کا علم نہیں ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آخر یہ اوڈیسہ کس بلا کا نام ہے؟''

''ایک تجارتی کمپنی ہے اوڈیسہ……جو آپ کے شوہر نے کئی لوگوں کے ساتھ مل کر قائم کی تھی۔ مرحوم نواب کمپنی کے مختار کل تھے۔ اب ان کی موت کے بعد دیگر حصے دار کمپنی کے مختار بننے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام شراکت داروں کے پاس ان کے اصل کاغذات موجود ہوں کیوں کہ ان کاغذات کی عدم موجودگی میں وہ مختار نہیں بن سکتے۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''کیا ان حصے داروں کے بارے میں بتاؤ گے کہ وہ کون ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

ابھی وہ حصے دار خود کو گمنام رکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اور……میں ان لوگوں کا قانونی مشیر ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کارڈ دکھایا۔

میں نے کارڈ پر نظر ڈالی پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کتنی رقم ہے؟''

''معلوم نہیں……مگر کافی ہے۔''

''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ کے موکل جو مطالبہ کررہے ہیں وہ اس کے لیے حق بہ جانب ہیں؟''

وہ ذرا بوکھلا سا گیا۔ ''وہ……وہ……دراصل……بات یہ ہے کہ کمپنی اور اس کا اکاؤنٹ ابھی تک آپ کے شوہر عارف سعیدی کے نام ہے۔ وہ قانونی طور پر اس کمپنی کے واحد حصے دار ہیں۔ میرے موکلوں کو اپنے حصص کے کاغذات چاہئیں جو نواب کے پاس تھے تاکہ وہ انہیں دکھا کر بینک سے اپنی رقم نکال سکیں۔''

''اس صورت پر جب کہ آپ کے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میرے علم میں کاغذات (حصص) ہوتے بھی تو میں انہیں آپ کے حوالے کیسے کرسکتی تھی؟''

''میڈم! اس لیے کہ آپ کے شوہر بھی یہی کرتے تھے۔''

''سنو مسٹر……!''

''چندی رام!''

''ہاں! مسٹر چندی رام!'' میں نے تپ کر کہا۔ ''مجھے اب پورا یقین ہوچلا ہے کہ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ آپ پہلے اپنے دعوے کی سچائی کا کوئی ثبوت میرے پاس لائیں۔ تب ہی کوئی بات ہوسکتی ہے۔''

''دیکھئے میڈم! میری بات کا یقین کریں۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔'' وہ منہ بگاڑ کر بولا۔

''آپ یہ بھلا کیسے کہہ……'' وہ رکا پھر شاید بات بدل کر اپنی روش پر اتر آیا۔ ''آپ کا شوہر مرچکا ہے اور مزید یہ کہ آپ کتنے خطرناک لوگوں کو چیلنج کررہی ہیں۔ ایک بات یاد رکھیے میں تو آرام سے بات کرکے چلا جاؤں گا۔ مگر……جو لوگ بعد میں آپ کے پاس اپنے مطالبے کے لیے یہاں آئیں گے، وہ……کسی اور طریقے سے بھی پیش آسکتے ہیں۔''

اس کے لرزہ دینے والے سپاٹ لہجے پر میں غصے کے باوجود اندر سے کانپ کر رہ گئی تھی۔ تاہم ذرا ہمت کرکے بولی۔ ''مسٹر چندی رام! تم جو کہہ رہے ہو، اگر وہ سچ ہے تو تب بھی میں وہ کاغذات ان کے حوالے کبھی نہیں کروں گی۔ یہ جاننے کے بعد کہ وہ کاغذات میرے علم میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ وہ مجھے گولی مارنے کی غلطی کبھی نہیں کریں گے۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ آپ کو قتل نہ کریں مگر زندہ چوہے آپ کے پیٹ میں داخل کردیں، تب کیا ہوگا؟'' وہ انتہائی سفاک لہجے میں بولا۔ ''میں جھرجھری سی لے کر رہ گئی اور تب مجھے ایک لرزہ خیز خیال آیا۔ میں نے تشکیک بھرے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا ان ہی لوگوں نے میرے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جن کا تم ذکر کررہے ہو؟''

وہ نفی میں اپنی گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، وہ لوگ آپ کے شوہر کو پسند کرتے تھے۔'' پھر کچھ لمحے توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''براہ مہربانی مجھے ان کے شیئرز سرٹیفکیٹس عنایت کردیں تاکہ میرے موکل آپ کی طرف سے اپنا ذہن صاف کرلیں۔''

پھر اس نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی اور سرسراتے ہوئے بولا۔ ''یہ شخص ان میں سے ایک ہے، جنہوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔''

میں تصویر دیکھ کر کانپ گئی۔ یہ وہ شخص تھا جو نواب کے جنازے میں شریک تھا۔ اور ستون کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کررہا تھا۔

''اب بہت ہوگیا میڈم! پلیز۔ خطرات کو دعوت نہ دیں۔'' وہ بولا۔ ''میرے موکل اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی خطرناک قسم کا حربہ استعمال کرسکتے ہیں۔''

اس کے لہجے میں کھلی دھمکی عود کر آئی تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بڑی پھرتی کے ساتھ میز کی دراز سے نواب کا ریوالور نکال لیا اور اس کی طرف نال کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔ اگر تم دوبارہ جمال گڑھ میں نظر آئے تو میں تمہیں گولی ماردوں گی۔''

اس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مجھے گھور کر دیکھنے لگا، پھر جیسے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی وقت ہے۔ دو روز کا وقت……سوچ لیں، ممبئی میں مجھ سے مل کر میرے موکلوں کی خواہش پوری کردیں۔ آپ کے لیے اس سے بہتر……''

میں اس کی بات کاٹ کر ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ''میں کہتی ہوں نکل جاؤ یہاں سے……ورنہ……''

میرا ریوالور والا ہاتھ کپکپانے لگا۔ وہ خاموشی سے نکل گیا۔

o……o……o

رباطہ اور چندی رام کی اس خطرناک ملاقات کا حال جان کر میں سناٹے میں آگیا تھا۔ میں خاصی دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''چندی رام کے جانے کے بعد آپ نے کیا کیا؟''

''میں کیا کرتی؟''

''میں سمجھ رہا تھا آپ نے فوراً پولیس انسپکٹر ڈھونگ راج کو بلوا کر ساری تفصیل بتادی ہوگی؟''

''ارادہ میرا یہی تھا پھر یہ سوچ کر میں خاموش ہوگئی کہ پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پولیس نواب کے تجارتی ذرائع کے متعلق فوراً تحقیقات شروع کردیتی جو مجھے منظور نہ تھا۔''

''اوڈیسہ نامی کمپنی کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے متعلق مجھے علم نہیں۔'' رباطہ بولی۔ ''تاہم میں اس کے لیے ہی ممبئی آئی تھی تاکہ کالی گاپ جا کر اوڈیسہ کی تفصیل جان سکوں۔''

''آپ کو شاید خدشہ ہوگا کہ وہاں چندی رام آپ کے راستے میں مزاحمت کرے گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! ممکن ہے کہ ایسا ہو۔'' وہ اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا آپ کو نواب کے خفیہ سیف میں اوڈیسہ سے متعلق کاغذات نہیں ملے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''چندی رام سے بات کرنے کے بعد آپ نے یقیناً ان کے سیف کی تلاشی تو لی ہوگی؟''

''ہاں! لی تھی تلاشی۔'' وہ بولی۔ اس کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''لیکن……کاغذات مجھے نہیں ملے۔'' اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔ ''اگر یہ معاملہ صاف نہ ہوا تو جمال گڑھ کی ریاست پر بہت بُرا وقت آجائے گا۔''

''چندی رام سے آپ کو کس قسم کا خطرہ لاحق ہے؟''

''وہ خطرناک آدمی ہے۔ بہت خطرناک۔'' رباطہ کا جسم لرزنے لگا تھا۔ ''اسلم، اسی لیے تو میں نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔ میں شیئرز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن چندی رام کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ مجھے ان کے بارے میں علم ہے۔''

''فرض کریں، اگر یہ شیئرز مل جاتے ہیں تو کیا آپ انہیں چندی رام کے حوالے کردیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''وہ ریوالور اس نے دوبارہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جو میں نے میز پر رکھ دیا تھا۔ تب وہ بولی۔ ''اسے اپنی جیب میں رکھو اور ہر وقت محتاط رہو، ممکن ہے کسی وقت یہ تمہیں استعمال کرنا پڑ جائے۔'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

میری آنکھیں نیند کے مارے بوجھل ہونے لگی تھیں اور میں سونا چاہتا تھا۔

میں نے چونک کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ گفتگو خاصی طویل ہوگئی تھی۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

o……o……o

کالی گاپ پہنچ کر رباطہ نے اس ہوٹل کا انتخاب کیا جہاں نواب سعیدی ٹھہرا کرتا تھا۔ اگر چہ پہلے سے بکنگ نہیں کرائی گئی تھی، پھر بھی جمال گڑھ کے نواب کی بیوہ کو سوئٹ حاصل کرنے میں چنداں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

ممبئی میں رباطہ نے بینکوں میں رقوم معلوم کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا تھا۔

وہ غسل وغیرہ میں مصروف ہوگئی تو میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ میں کچھ دیر شہر میں گھومنا چاہتا تھا۔

تب ایک عجیب اتفاق ہوا۔

ہوٹل سے باہر نکلا تو مجھے اپنا ایک پرانا دوست مل گیا۔ اس کا نام فیروز خان تھا۔ وہ بہت عرصے سے یہاں وکالت کررہا تھا، کئی بار اپنے بچوں کے کھلونے وغیرہ لینے کے لیے میری دکان آچکا تھا۔ آج کل اس کا شمار شہر کے کامیاب ترین وکیلوں میں ہوتا تھا۔ مجھے اس سے گفتگو کے دوران پتا چلا کہ کچھ روز قبل ایک کیس کے سلسلے میں اس سے رائے گوپال ملا تھا۔

میں ٹھٹکا۔ فیروز خان نے رائے گوپال کا پتا مجھے بتادیا۔

ہم دونوں تھوڑی دیر تک بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے رہے۔ پھر اس کے بعد وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اسے کسی سے ضروری ملاقات کرنا تھی۔

اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں یہاں سے جانے سے پہلے اس سے ضرور مل کر جاؤں اور اس کے گھر آؤں ورنہ وہ مجھ سے ناراض ہوجائے گا۔ میں اُس کی اس پیار بھری دھمکی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

اس کے جاتے ہی میں گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا تھا۔ رائے گوپال ایک بہترین نشانے باز کرائے کا قاتل تھا۔ مگر وہ کالی گاپ میں کیا کررہا تھا؟ نیز کیا وجوہ تھیں جس کے باعث اس نے نواب کی ملازمت چھوڑی تھی؟

میں یہ سوچ کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا کہ شاید میری اُس سے ملاقات سودمند ثابت ہو۔ عین ممکن تھا کہ میں اس کی مدد سے نواب کے قاتلوں تک پہنچ جاتا؟

جو پتا فیروز خان نے مجھے بتایا تھا، وہ غلط نہ تھا۔

ذرا دیر بعد میں اس تنگ و تاریک راستے پر کھڑا تھا جو رائے گوپال کے فلیٹ کی طرف جاتا تھا۔ وہ ایک بڑی سی عمارت تھی جس میں ان گنت فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ رائے گوپال کا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔

میں اس فلیٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا جس کے دروازے پر کوئی تختی موجود نہ تھی۔ فلیٹ کی دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ ایک نامور نشانے باز کتنی گندی اور بوسیدہ جگہ پر رہائش پذیر تھا۔

میں نے گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دوبارہ بجائی اور وقفے وقفے سے بجاتا چلا گیا۔ مگر جواب پھر ندارد……میں نے سوچا۔ کہیں وہ نشے میں بے سدھ نہ پڑا ہو۔ ناچار میں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا اور اندر جھانکا۔ کمرا خالی تھا، میں اسے آوازیں دینے لگا۔

''گوپال……گوپال۔'' مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میری آواز کی بازگشت پورے فلیٹ میں گھوم کر میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ میں پرانے فرنیچر کو پھلانگتا بالآخر کچن تک آیا۔

کچن میں لائٹ روشن تھی، جس کا مطلب تھا وہ اندر ہے۔

میں نے دوبارہ آواز دی۔ ''گوپال… گوپال…'' مگر جواب نہ پاکر میں جھنجھلا کر کچن کے اندر داخل ہوگیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ایک کھانے کی میز پر سر رکھے ایک کیم شیم شخص سو رہا تھا۔ وہ رائے گوپال تھا۔ اس نے شاید بری طرح چڑھا رکھی تھی اور اب مدہوش ہوکر اس طرح پڑا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا، مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے جیسے کرنٹ لگا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

مجھے میز پر پھیلا ہوا خون صاف نظر آگیا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن پر ایک گہرا کٹ لگا ہوا نظر آرہا تھا۔ کسی تیز دھار آلے سے اس کی گردن آدھی کاٹ دی گئی تھی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا کہ مجھے وہ خون بھی نظر آگیا جو اس کے کپڑوں کو بھگوتا ہوا فرش پر پھیل گیا تھا۔ کسی نے اسے قتل کردیا تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ اسے قتل ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اس کی گردن کے زخم سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔

میں گوپال کو مردہ دیکھ کر بوکھلا گیا تھا اور اس صورت حال میں جو پہلا سنسناتا خیال میرے ذہن میں ابھرا، وہ یہ تھا کہ مجھے فوراً سے پیشتر یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ بہ صورت دیگر نواب سعیدی کے قتل کی طرح یہ قتل بھی میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔

میں فلیٹ سے نکل کر بھاگنا چاہتا تھا کہ رک گیا۔ میرے چشم تصور میں دو چہرے ابھرے، جنہیں نواب کے حادثے کے بعد بے ہوش ہوجانے سے پہلے میں نے خود پر جھکے اور اپنی تلاشی لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک عورت تو دوسرا مرد تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ مرد رائے گوپال تھا، کیوں کہ مجھے اس کا چہرہ شناسا سا لگ رہا تھا۔

میں بے ساختہ اس پر جھک گیا اور اس کی تلاشی لے ڈالی۔ جلد ہی مجھے وہ لفافہ مل گیا جس میں نیلے رنگ کا نگ رکھا ہوا تھا اور جس میں نواب سعیدی نے خصوصی دلچسپی لی تھی۔ میں نے فوراً وہ لفافہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

میں کچن سے نکل کر فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھا تو اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ پل کے پل مجھے یہ سرسراتا ہوا احساس ہوا تھا کہ فلیٹ میں اس وقت اور بھی کوئی موجود ہے۔

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ اترتی محسوس ہونے لگی۔ (جاری ہے)

شاطر کھلاڑی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط : 4

مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے فلیٹ میں کوئی کراہ رہا ہو۔

میرے چاروں طرف تاریکی تھی۔ یہ جاننے کے لیے آواز کس سمت سے آرہی ہے، میں گھٹنوں کے بل فرش پر جھک گیا اور اندھیرے میں فرش ٹٹولنے لگا۔ جلد ہی میرے ہاتھوں نے نرم اور گداز وجود کو چھوا اور اندھیرے کے باوجود مجھے اندازہ لگانے میں مطلق دشواری نہ ہوئی کہ وہ کوئی نسوانی جسم تھا۔

''کون ہو تم......؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

جواب میں نقاہت بھری سسکی کے ساتھ بڑبڑانے کی آواز ابھری۔ میں اس کمزور اور غیر واضح بڑبڑاہٹ کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔

''تت......تم کون ہو......؟ یہاں کیا کررہی ہو؟'' میں نے اس بار ذرا تیز آواز میں پوچھا۔ ''کہیں تم نے تو گوپال کو قتل نہیں کیا؟''

''نن......نہیں......نن......نہیں......!'' نحیف و نزار نسوانی آواز ابھری۔ ''میں جب یہاں آئی تو میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا تھا، میں اسے مردہ دیکھ کر خوف سے بے ہوش ہوگئی۔''

میں سرہلا کررہ گیا۔ گوپال کو جس بھیانک انداز میں قتل کیا گیا تھا، اس کے پیش نظر یہ بات ناممکن نہیں تھی کہ کوئی کمزور دل آدمی اس کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہوجائے، وہ تو پھر لڑکی تھی مگر سوال یہ ذہن میں ابھرتا تھا کہ اگر یہ لڑکی قاتلہ نہیں تو پھر آخر کس نے گوپال جیسے کیم شیم شخص کو یوں آسانی سے بے بس کرکے بیدردی سے ذبح کردیا، کون تھا اس کا قاتل......؟

ذہن پر پیہم زور دینے کے باوجود میں کوئی سراغ تلاش نہ کرپایا۔

میں نے اس نیم بے ہوش لڑکی سے کہا۔ ''اچھا! چلو اٹھو...... تم چل تو سکتی ہو نا......؟'' میں نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ ٹٹول کر پکڑا۔

''ہاں!'' لڑکی نے ہولے سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''تت......تم...... مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے خوف بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں! میں پولیس کے فضول چکروں میں نہیں پڑا کرتا۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

میری حوصلہ افزائی پر وہ میرا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں فلیٹ سے باہر آگئے۔ سیڑھیوں سے نیچے پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ''تم ذرا ادھر ٹھہرو، میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' لڑکی نے کہا۔ پھر پارکنگ لاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میری کار وہاں کھڑی ہے، یہ لو چابی!''

میں نے مذکورہ سمت پر کار کھڑی دیکھی اور چابی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں کار ڈرائیو کروں۔ میں چابی لے کر کار کی طرف بڑھ گیا۔

ہم کار میں سوار ہوئے اور روشن سڑک پر آگئے۔ میں نے لڑکی کا جائزہ لیا اور اس بری طرح ٹھٹک گیا کہ کار کا اسٹیئرنگ میرے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے نواب سعیدی کی کار کے حادثے کے فوراً بعد خود پر جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اسے فوراً پہچان گیا تھا۔

''تم......تم...... وہی ہو نا جو مجھے اس جگہ نظر آئی تھیں جہاں نواب عارف سعیدی کی کار کو حادثہ پیش آیا تھا؟'' بالآخر میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''میرا شبہ درست ہے؟''

''نہیں...... بالکل نہیں!'' لڑکی ایک دم مسکرا کر بولی۔ وہ اب کافی سنبھل چکی تھی۔

میری کھوپڑی بھک سے اڑگئی۔ میں بولا۔ ''تمہیں نواب سعیدی کے قتل کا تو علم ہوگا؟''

''کون نواب سعیدی......؟'' لڑکی نے الٹا سوال داغ دیا۔ ''میں اس نام کے کسی نواب سے واقف نہیں ہوں۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ صاف مکر گئی تھی مگر کیوں......؟ میرے ذہن میں سوالیہ نشان ابھرا۔ میں اس کے منہ سے سچائی اگلوانے کی تدبیر سوچنے لگا لیکن فوری طور پر میرے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آسکی۔

معاً لڑکی نے کہا۔ ''مسٹر اجنبی......! میں اب بالکل ٹھیک ہوں...... تم جہاں چاہو، کار روک کر کار سے اتر سکتے ہو، میں اب ڈرائیونگ کرسکتی ہوں۔''

میں نے اس کی بات سن لی تھی لیکن نظر انداز کردی۔ میں نے کار روکنے کے بجائے ذیلی سڑک پر ڈال دی جو سنسان پڑی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات ابھرے تھے۔

''تم یقیناً پولیس کے آدمی ہو۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے تشکیک بھرے لہجے میں بولی۔

''میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور نظریں اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ تم گوپال کے فلیٹ میں کیوں گئی تھیں؟''

وہ چند ثانیے گردن جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ میں نے گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ شدید متذبذب نظر آرہی تھی۔ بالآخر بولی۔ ''میں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں اس سے ملنے گئی تھی۔''

''مجھے یقین ہے پھر گوپال کو تم نے ہی قتل کیا ہے۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

وہ فوراً سر جھٹک کر بولی۔ ''نہیں! میں جب اندر داخل ہوئی تو وہ قتل ہوچکا تھا، البتہ میں نے ایک شخص کو اس کے فلیٹ سے نکلتے دیکھا تھا، میں نے اس کی تصویر بھی اتار لی ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر اپنے شانے پر جھولتے ہوئے کیمرے کو تھپتھپایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے اب ذرا نواب سعیدی کے بارے میں بتاؤ۔''

لڑکی نے ایک سگریٹ سلگالی۔ وہ گہرا کش بھر کر دھواں اگلتے ہوئے بولی۔ ''میں نواب سعیدی کو نہیں جانتی۔''

''ٹھیک ہے......نواب سعیدی کو تم نہیں جانتیں!'' میں نے کہا۔ ''مگر تم نے نواب کی جان کیوں لی؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔

وہ شدید جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ''آخر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تم جس نواب کا بار بار ذکر کررہے ہو، میں اسے بالکل نہیں جانتی۔''

''میں تمہاری یہ بات نہیں مان سکتا۔'' میں نے بھی جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ میں نے تمہیں جائے حادثہ پر کار سے نکلتے دیکھا تھا اور وہ بھی گوپال کے ساتھ......!''

''تم مجھے تنگ کررہے ہو۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔

''سنو لڑکی......! تم مجھے بے وقوف نہیں بناسکتیں، تم یہ بھی جانتی ہو کہ میرے سر پر چوٹ کیسے لگی تھی، اس لیے بہتر ہوگا کہ میرے سوالوں کا جواب دو ورنہ کوئی سخت قدم بھی اٹھا سکتا ہوں۔''

وہ خاموش رہی۔

کچھ توقف کے بعد میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔ ''تم مجھے جمال گڑھ کے ہوٹل میں پہلی بار ملی تھیں، وہاں کیا کررہی تھیں......؟ تم نے نواب عارف سعیدی کے بارے میں اتنی دلچسپی کا اظہار کیوں کیا تھا؟ تم نے نواب کو کیوں قتل کیا......؟''

''میں تمہارے سوالوں کو مسترد کرتی ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں مسکرا کر بولی۔ ''میں نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو...... پہلی بات تو یہ کہ میں کبھی جمال گڑھ نہیں گئی، اس سے پہلے میں تم سے کبھی ملی ہوں اور نہ ہی میں نے کسی عارف سعیدی نامی کسی نواب کو قتل کیا ہے، ہوسکتا ہے تم جس لڑکی کا ذکر کررہے ہو، وہ میری کوئی ہم شکل ہو، تمہیں یقیناً کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

اس کی باتوں نے مجھے الجھن میں مبتلا کردیا۔ ایسا ہونا ناممکن تھا مگر لڑکی کا لہجہ اتنا پُر یقین تھا کہ میں چند ثانیے کے لیے شپٹا کررہ گیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ لڑکی مجھے دھوکا دینے کی کوشش کررہی ہے اور مجھے بے وقوف بنارہی ہے۔

میں نے اسے ڈرانے کی غرض سے کہا۔ ''ٹھیک ہے پھر میں ابھی جمال گڑھ کے پولیس انسپکٹر ڈھونگ راج کو فون کرتا ہوں اور اسے سب کچھ بتائے دیتا ہوں، اپنے اور تمہارے بارے میں......! اس کے بعد تمہاری گردن جمال گڑھ پولیس انسپکٹر کی گرفت میں ہوگی۔''

میں نے خاموش ہوکر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ میں مزید آگے بولا۔ ''اور اگر پولیس انسپکٹر نے تمہیں دھرلیا تو وہ چندی رام کے ساتھ ملوث کرکے تمہارا حشر خراب کردے گا۔''

''چندی رام......؟ تم......تم چندی رام کو کیسے جانتے ہو؟'' وہ یکدم چونک کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ میرا اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم نے چندی رام اور گوپال کے ساتھ مل کر نواب سعیدی کا قتل کروایا تھا۔''

''تت......تم آخر ہو کون......؟'' وہ بوکھلا کر بولی۔ ''کیا تمہارا پولیس سے تعلق ہے؟''

''میں درپردہ نواب سعیدی کے قاتل کا سراغ لگا رہا ہوں...... وہ میرا بچپن کا دوست تھا، میرا پولیس سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گی، وہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا، میں صرف حقیقت جاننا چاہتا ہوں اور بس......!''

وہ چند ثانیے پُر سوچ خاموشی کے بعد سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولی۔ ''میرا نام ازابیلا ہے، نواب سعیدی کی موت واقعی کار کے حادثے میں ہوئی تھی، میری نواب سے کوئی دشمنی نہ تھی، میرا مطلب ہے نواب کو مارنا نہیں چاہتی تھی، میرا تعلق مجاہدین کے ایک گروپ سے ہے، میرا ایک ساتھی بھی ہے اسحٰق......! ہم نواب کے ذریعے دیواس کھنہ تک پہنچنا چاہتے تھے، ہمارا اصل شکار وہ تھا، ہماری معلومات کے مطابق دیواس کھنہ میڈیا والوں کو مجاہدین کو دنیا کے سامنے دہشت گرد شو کرنے کے لیے خطیر رقم دیتا ہے، اس کے علاوہ ہمارا ایک مہرہ اور بھی ہے، جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں!''

میرے اس سوال پر کہ انہیں نواب سعیدی اور میرے ممبئی جانے کے پروگرام کا کیسے علم ہوا؟

ازابیلا نے بتایا کہ ہم لوگ پیٹرول پمپ کی نگرانی کررہے تھے، وہاں نواب کی کار میں پیٹرول بھرا گیا تھا کہ ہمیں علم ہوگیا کہ اس کا رخ ممبئی کی طرف ہے مگر ہماری معلومات کے مطابق تم اور نواب دیواس کھنہ سے خفیہ ملاقات کرنے جارہے تھے، نواب بہت تیز رفتاری سے کار چلا رہا تھا، ہم اسے روک کر گن پوائنٹ پر دیواس کھنہ کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔ (اسے معلوم نہ تھا کہ نواب اور دیواس کے مابین آج کل ٹھنی ہوئی تھی) اسے روکنے کی ایک ہی صورت تھی کہ کار کے ٹائر کو ناکارہ بنادیا جائے، اس مقصد کے لیے اسحٰق کی ہدایت پر رائے گوپال نے نواب کی کار پر فائر کردیا۔ اسے ہمارے اور ہمارے مشن کے بارے میں علم نہ تھا۔ اسحٰق نے پہیوں پر فائر کیا تھا، ہماری نیت نواب سعیدی کو قتل کرنے کی نہیں تھی۔''

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ صورتحال زیادہ گمبھیر نہ تھی۔ یہ لڑکی اور اس کا ساتھی اسحٰق کشمیر کاز کے سلسلے میں ادھر آئے تھے۔ مجھے ان کے مشن سے کوئی غرض نہ تھی، میں تو اپنے مرحوم دوست نواب عارف سعیدی کی حسین بیوہ رباطہ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

اور سچی بات یہ تھی کہ اپنا نقصان بھی پورا کرنا چاہتا تھا جو مجھے رباطہ کی مدد کرنے کی صورت میں پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔ ویسے بھی میں اسے ان حالات میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت دیدہ و نادیدہ دشمنوں کے بیچ گھری ہوئی تھی۔

میں جب بھی اس سارے معاملے پر لعنت بھیج کر واپس لوٹ جانے کی سوچتا تو مرحوم نواب کا چہرہ میرے سامنے آجاتا اور پھر میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگتا۔ کچھ بھی سہی نواب عارف میرا ایک اچھا دوست تھا۔ اس نے بڑی نیک نیتی سے میرے بیش قیمت اور نایاب ٹکٹوں کی شایان شان قیمت لگائی تھی ورنہ مجھے تجربہ نہ تھا۔ وہ ان ٹکٹوں کی کم قیمت بھی لگا سکتا تھا۔ بس اس کی یہ فراخ دلی اور سچی نیت مجھے پسند آگئی تھی۔

میں نے ازابیلا سے پوچھا۔ ''گوپال کا قتل کیسے اور کیونکر عمل میں آیا؟''

''وہ بدبخت بعد میں چندی رام کے ساتھ مل کر ہمیں بلیک میل کررہا تھا، اس لیے اسے خاموش کردینا ضروری تھا۔''

میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی۔ گویا گوپال کی قاتل وہی تھی اور اس سے پہلے اس نے جو بتایا تھا، وہ سب جھوٹ تھا۔

''جمال گڑھ کے ہوٹل کا منیجر پیڈ رو کیسے زخمی ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا۔'' ازابیلا بتانے لگی۔ ''بلکہ نواب سعیدی کی تدفین کے دوران چندی رام کے ساتھیوں نے اس کی پٹائی کی تھی، وہ نواب کی حمایت میں بول رہا تھا۔''

''نواب کا بریف کیس کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میرے خیال سے نواب کے قتل والا معمہ حل ہوا چاہتا تھا۔

''تمہیں اس بریف کیس سے کیا دلچسپی ہے؟'' ازابیلا نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''اس لیے کہ اس کے اندر میرے ٹکٹوں کا ذخیرہ موجود ہے جو میں نے پچاس لاکھ میں نواب کو فروخت کردیے تھے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس کا دیا ہوا چیک بھی اسی میں ہے لیکن وہ نواب کی موت کے بعد کیش نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا میرے ٹکٹ مجھے واپس مل جانا چاہئیں۔''

''تمہیں تمہاری امانت مل جائے گی۔'' ازابیلا نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تمہیں میرے ہوٹل چلنا ہوگا جہاں میرا قیام ہے۔''

میں نے کار کا رخ اس کے بتائے ہوٹل کی طرف کردیا۔

اب میں نے ذہنی طور پر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

ازابیلا جس ہوٹل میں مقیم تھی، وہ ایک درمیانے درجے کا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ازابیلا نے ایک بند کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں کسی کی اندر سے بھاری آواز ابھری۔ ''کون ہے؟''

''دوست......!'' ازابیلا نے کہا۔ شاید یہ کوئی کوڈ ورڈ تھا جسے سنتے ہی دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔

ازابیلا مجھے لے کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ اندر ایک پرکشش نقوش، جاذب نظر اور نسبتاً طویل قامت نوجوان موجود تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو ازابیلا نے آگے بڑھ کر میرا تعارف کرایا۔

یہ اسحٰق تھا، اس کا ساتھی! میں نے کہا۔ ''میں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا، براہ کرم میرے ٹکٹ واپس کردیے جائیں۔''

ازابیلا نے اسحٰق کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے کمرے سے وہ بریف کیس اٹھا لایا جس میں ٹکٹ موجود تھے۔

میرا دل فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔ مجھے ٹکٹوں کی بازیابی کی کوئی امید نہ تھی مگر اب وہ میرے سامنے تھے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے بریف کیس سے ٹکٹوں کا البم نکال لیا۔ میرے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ دوڑ گئی مگر پھر دوسرے ہی لمحے یہ مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ وہ سارے جلے ہوئے تھے، ان میں سوراخ بنے ہوئے تھے۔ بعض ٹکٹوں پر تو دو تین بڑے بڑے سوراخ موجود تھے۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں بھیگی نظروں سے ٹکٹوں کو دیکھنے لگا۔

میرے چشم تصور میں وہ پچاس لاکھ رقص کررہے تھے جو میری دسترس میں آتے آتے رہ گئے تھے۔

''بریف کیس ریوالور کی مدد سے کھولا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ سارے ٹکٹ خراب ہوگئے۔'' اسحٰق نے میری افسردہ کیفیت بھانپ کر کہا۔

☆......☆......☆

رات گیارہ بجے کے قریب میں رباطہ کے اپارٹمنٹ کے قریب پہنچا تو اندر سے ایک اجنبی نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ چہرے مہرے سے وہ بظاہر معقول شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بھی میری طرف ایک سرسری نگاہ ڈالی، اس کے بعد وہ تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں گم صم کھڑا رہ گیا۔ اس نے اگرچہ اچٹتی نظروں سے میری جانب دیکھا تھا مگر اس قلیل عرصے میں بھی مجھے یوں لگا جیسے دو دہکتے ہوئے انگارے آنکھوں کے راستے میرے وجود میں سرایت کرگئے ہوں۔

میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو رباطہ کو ایک بڑے سے صوفے پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی، اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ میں نے اسے ساری تفصیل بتائی اور اس اجنبی کے بارے میں پوچھا۔

''چندی رام تھا۔''

''کیا پھر دوبارہ آپ کو دھمکانے آیا تھا؟''

''نہیں! وہ ایک پیشکش کرگیا ہے، اگر حصہ داری کے سرٹیفکیٹ واپس کردیے جائیں تو اس کے عوض وہ کل رقم میں سے دس فیصد مجھے دے دے گا۔''

''آپ نے کیا جواب دیا؟''

''یہی کہ سوچ کر جواب دوں گی۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تم مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ اب فوراً تیار ہوجاؤ، دو گھنٹے بعد ہی ہمیں ہوڑانگر جانا ہوگا۔''

''وہ کس لیے؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں بینک منیجر سے ملاقات کرچکی ہوں، اس نے مجھ سے پورا تعاون کیا ہے اور نواب کے کھاتے سے متعلق ساری تفصیل بتادی ہے اوڈیسا کے کاغذات بینک میں نہیں تھے، منیجر نے یہ انکشاف بھی کیا کہ نواب نے چند روز قبل اپنا ایک نیا وصیت نامہ ہوڑانگر کے لیے ایک معروف وکیل کے توسط سے مرتب کروایا ہے، اس وصیت نامے کے مطابق نواب نے اپنی ہر چیز میرے نام کردی تھی۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ انکشاف میرے لیے حیران کن تھا۔

''اب ہمیں وہ وصیت نامہ حاصل کرنے کے لیے ہوڑانگر جانا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اور وکیل سے بھی ملنا ہوگا۔''

☆......☆......☆

ایک گھنٹے بعد ہی ہم دونوں کار میں بیٹھ کر ہوڑانگر روانہ ہوگئے۔ میں ذہنی طور پر الجھ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جمال گڑھ میں قانونی مشیر کی موجودگی میں اس نے اپنا نیا وصیت نامہ ہوڑانگر میں کیوں مرتب کروایا تھا۔

ہوڑانگر پہنچ کر ہمارا قیام ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہا جو نواب سعیدی ہی کی ملکیت تھا اور جسے وہ کبھی کبھار ہی استعمال کرتا تھا۔

صبح ہوتے ہی ہم وکیل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جس کا نام منور بیگ تھا اور جس سے نواب سعیدی نے اپنی نئی وصیت مرتب کروائی تھی۔ ہم اس کے دفتر جا پہنچے۔ وہ خلاف توقع بند تھا۔

میں نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھا تو ایک لرزہ خیز انکشاف ہوا۔

منور بیگ کو گزشتہ شب کسی نے قتل کردیا تھا۔

نامعلوم قاتل سوتے میں اس کے گلے پر چھری پھیر کر فرار ہوگئے تھے۔ میری مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ سب سے زیادہ حالت رباطہ کی خراب تھی۔ وہ سن ہوکر رہ گئی تھی۔ ہم دوبارہ اس چھوٹے سے بنگلے میں پہنچ گئے جہاں ہمارا قیام تھا۔

''اب کیا کیا جائے؟'' رباطہ نے نڈھال لہجے میں کہا اور خود کو صوفے پر گرادیا۔

میں صرف شانے اچکا کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا پھر میں اسے کیا جواب دیتا۔ کافی غور و فکر کے بعد میں نے اس بنگلے کی تلاشی لینے کا مشورہ دیا۔ بظاہر یہ ایک عجیب مشورہ تھا مگر اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ ہم دونوں نے مل کر بنگلے کے چپے چپے کی تلاشی لے ڈالی لیکن وہاں سے کوئی ایسی چیز برآمد نہ ہوئی جو ہمارے لیے مفید ثابت ہوتی۔ رباطہ تھک کر بیٹھ گئی۔

''بیکار ہے اسلم! کوئی فائدہ نہیں اس بے مصرف تلاشی کا۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔

مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ کئی گھنٹوں کی تلاشی کے بعد کچن کی چمنی میں موجود ایک خفیہ خانے سے مجھے کچھ مل گیا۔ وہ خفیہ خانہ کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ کسی کا دھیان اس طرف نہیں جاسکتا تھا۔ خفیہ خانے کو دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔

میں نے خفیہ خانے کے بارے میں رباطہ کو بتایا تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرط جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے میرے ساتھ کچن میں چلی آئی۔ کچن کی چمنی میں موجود خفیہ خانے سے میری توقع سے بھی کچھ زیادہ ہی برآمد ہوا تھا۔

وصیت نامہ، وہ کاغذات جو اوڈیسا کمپنی کے حصے داری کے تھے، شیئرز ہولڈروں کی مکمل فہرست اور ان کی لگائی ہوئی رقوم کی تفصیل..! کامیابی کے بے پایاں مسرت آمیز احساس سے رباطہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

ان چیزوں کے ساتھ ہی خفیہ خانے سے مجھے ایک درجن خاکستری رنگ کے بڑے بڑے لفافے بھی ملے جن میں ہر ایک میں پچاس لاکھ روپے بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ یہ بڑے نوٹ تھے۔

رباطہ نے خوش ہوکر ایک لفافہ مجھے بخش دیا، یہ میرا انعام تھا۔

اگر میں اسے بنگلے کی تلاشی لینے کا مشورہ نہ دیتا اور یہ خفیہ خانہ تلاش نہ کرلیتا تو وہ شاید زندگی بھر ان چیزوں کو نہیں پاسکتی تھی۔ میں نے رباطہ کی نظر بچا کر ایک اور لفافہ اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ رباطہ کو میری اس حرکت کا علم نہیں ہوسکا۔ وہ وصیت نامہ پڑھنے میں منہمک تھی۔ اسے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ہوڑانگر آنا انتہائی فائدہ مند رہا تھا۔

خفیہ خانے میں نواب سعیدی کی ایک چھوٹی سی نوٹ بک بھی برآمد ہوئی تھی۔ رباطہ نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی تو میں نے اسے اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اب ہوڑانگر میں رکنا بے سود تھا۔ کچھ دیر بعد ہماری کار کالی گاپ کی طرف اڑی چلی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرا دن ہمارا کالی گاپ میں طلوع ہوا۔

میں یوں ہی اپنے وکیل دوست کے دفتر میں جا پہنچا۔ اس نے مجھے بتایا۔

''اوڈیسا کمپنی کے حصہ داروں کی جلد ہی ایک میٹنگ ہونے والی ہے، شنید تھی کہ نواب سعیدی کے بعد کمپنی کو چلانے کے لیے چندی رام کو کمپنی کا مختار کل بنادیا جائے گا، کمپنی کے دس ہزار شیئرز تھے اور ہر شیئر دس لاکھ کی مالیت کا تھا جن میں سے پانچ سو دس شیئرز نواب کے تھے جو بالآخر رباطہ کے نام ٹرانسفر ہونے تھے اور رباطہ کے لیے لازم تھا کہ وہ اس میٹنگ میں ضرور شرکت کرے کیونکہ نواب کے مرنے کے بعد اب وہی ان حصص کی مالک تھی۔

اپنے دوست وکیل کے دفتر سے نکل کر میں ازابیلا کے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

اب رفتہ رفتہ گرہیں ایک ایک کرکے کھلتی جارہی تھیں۔ میں گنگناتا ہوا پیدل ہی اس کے ہوٹل کی طرف چل دیا تھا۔ وہ مجھے ہوٹل کے دروازے پر ہی مل گئی، وہ کہیں جارہی تھی مگر مجھے دیکھ کر رک گئی۔

کچھ دیر تک بات ہوتی رہی پھر دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے وہ چلی گئی۔ اس نے ملاقات کے لیے بیڈن جھیل کا پتا بتایا۔ اس کے جاتے ہی میں پلٹا مگر دوسرے ہی لمحے ٹھٹک کر رک گیا۔

میں نے چندی رام کو دیکھا تھا جو ذرا ہٹ کر کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اسے دیکھ کر جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ پتا نہیں وہ کب سے میرا تعاقب کررہا تھا۔

ازابیلا جیسے ہی میری نظروں سے اوجھل ہوئی، وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کا انتخاب تو بہت اچھا ہے مسٹر اسلم!'' اس نے مجھے میرے نام سے پکارا۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''تم صرف میرے انتخاب کی داد دینے کے لیے تو یہاں نہیں آئے ہوگے؟''

''میں آپ کے لیے ایک پیشکش لے کر آیا ہوں۔'' وہ فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔

''میں بھی سنوں ذرا......!'' میں شانے اچکا کر بظاہر بے توجہی سے بولا۔

''میں آپ کو پورے پچیس لاکھ روپے دوں گا، آپ آج ہی رباطہ کو لے کر یہاں سے جمال گڑھ چلے جائیں۔''

''لاؤ نکالو رقم......!'' میں نے فوراً اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلادی۔ اس نے واقعی ہاتھوں ہاتھ اتنی خطیر رقم مجھے ادا کردی۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں فیروز خان کے ساتھ کار میں بیٹھا بیڈن جھیل کی طرف اڑا چلا جارہا تھا۔

فیروز خان نے راستے میں مجھے بتایا کہ بیڈن جھیل بڑی خطرناک جھیل ہے، اس میں غوطہ خوری کی کوشش بھول کر مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے، گزشتہ سال وہاں کئی حادثے ہوچکے تھے۔ جو جھیل میں اترا پھر زندہ کنارے پر نہ لوٹ سکا۔

''میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گا، ویسے میں وہاں صرف اپنے دوستوں سے ملنے جارہا ہوں۔''

فیروز خان نے مجھے بیڈن جھیل کے پاس اتار دیا اور خود ایک ساحلی ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

میں جھیل کے کنارے گھوم ہی رہا تھا کہ ایک چٹان کے عقب سے ازابیلا اور اس کا ساتھی اسحٰق نکلتا دکھائی دیا۔ وہ غوطہ خوری کا لباس پہنے جھیل میں اترنے کی تیاری کررہے تھے۔ میں نے انہیں جھیل میں غوطہ خوری کے خطرناک نتائج سے خبردار کیا تو وہ دونوں بے ساختہ ہنس پڑے، جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

''ہم اپنے مشن کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں اور لے بھی سکتے ہیں۔'' اسحٰق نے کہا۔ ''پچھلے سال یہاں ایک ایسے آدمی کو قتل کردیا گیا تھا جس کی بعد میں شناخت تک نہ ہوسکی، اسے میں نے مارا تھا کیونکہ وہ ہمارا تعاقب کررہا تھا۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جھیل میں غوطہ خوری کرنے پر کیوں تلے ہوئے تھے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر میں واپس شہر کی طرف لوٹ گیا۔ شام کو جب میں فیروز خان سے ملا تو اس نے بتایا کہ رباطہ کا ممبئی جاکر اوڈیسا کمپنی کے حصے داروں کی تائید حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر ایک رکن بھی مخالفت پر اتر آیا تو رباطہ کو اوڈیسا کمپنی کے حصص نہیں مل سکتے۔

اس کے علاوہ ممبئی میں دیواس کھنہ سے ملاقات کی جائے، وہ اوڈیسا کمپنی کا تیسرا بڑا شیئر ہولڈر ہے، کمپنی کا وجود ختم کرنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ دیواس کھنہ کو اس معاملے میں مکمل اعتماد میں لیا جائے، اس کے تعاون کے بغیر رباطہ کچھ نہیں کرسکتی۔ رباطہ کے ساتھ میرا دوبارہ ممبئی جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

چندی رام کو اگر پتا چل جاتا تو وہ ہمارے راستے میں مشکلات کھڑی کرسکتا تھا۔ میں نے جب یہ بات رباطہ کو بتائی تو وہ الجھن آمیز پریشانی میں مبتلا ہوگئی۔ دیواس کھنہ ساری زندگی نواب سعیدی کا حریف رہا تھا، اسے رباطہ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کرلینا آسان نہیں تھا۔

دو گھنٹے بعد جب میں رباطہ کے اپارٹمنٹ سے نکل کر لفٹ کی طرف بڑھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چندی رام لفٹ کے قریب کھڑا انتظار کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سرد انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں خونخواری شامل تھی۔

''کیا پچیس لاکھ ناکافی تھے مسٹر اسلم......؟'' وہ ہولے سے غرایا۔

میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''تم کروڑوں روپے کے حصول کے لیے کوشش کررہے ہو۔'' میرے لہجے میں بے خوفی تھی۔ ''اور مجھے صرف پچیس لاکھ پر ٹرخانا چاہتے تھے۔''

''میں تمہیں دس لاکھ اور دے دیتا ہوں۔'' وہ میری طرف دیکھ کر دانت پیسنے لگا۔ ''مگر ایک شرط پر!''

''کیسی شرط......؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ تم رباطہ کے ساتھ ممبئی جارہے ہو، دیواس کھنہ کو یہاں لاؤ تو مجھ سے ضرور ملوانا۔''

''تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''یہ میرا مسئلہ ہے۔''

''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔'' بالآخر میں نے کہا۔ ''رقم دو۔''

وہ عیاری سے بولا۔ ''پہلے اپنا وعدہ پورا کرو۔''

''وعدہ کرتا ہوں، میں تمہیں دیواس سے ملوادوں گا۔'' مجھے حیرت تھی کہ اتنی جلدی اسے ہمارے ممبئی جانے کا علم کیسے ہوگیا۔

چندی رام چلا گیا۔ میں رباطہ کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ میرے ذہن میں ایک شبہ گردش کررہا تھا، میں اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے رباطہ کے کمرے کی تلاشی لی، مجھے فوراً ایک میز کے نیچے ننھا سا مائیکروفون چپکا ہوا نظر آگیا۔ اس سے ملحق تار قالین کے نیچے سے ہوتا ہوا دروازے کے باہر چلا گیا تھا۔ مجھے یہ جاننے میں چنداں دشواری نہ ہوئی کہ چندی رام کو ہمارے پروگرام کا پتا کیسے چلا تھا۔ میں نے مائیکروفون کو میز کے نیچے سے نکالا اور جوتے کی ایڑی سے چکنا چور کردیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ہم ممبئی میں تھے۔

دیواس کھنہ ہمیں اپنی عالیشان محل نما رہائشگاہ پر مل گیا تھا۔ ایک باوردی ملازم ہمیں وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہاں ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر گزری، دیواس آگیا۔ رباطہ اسے دیکھتے ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک خاصا قد آور اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ گنجا سر جس کی آنکھوں کے حلقوں میں سیاہی اتری ہوئی تھی، اس کے دیدے تیزی سے مکارانہ انداز میں گردش کررہے تھے۔ یہ ایک خود غرض اور سخت گیر آدمی کا چہرہ تھا۔

اس نے قدرے چونک کر ہماری طرف باری باری بغور دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے جن میں الجھن کی آمیزش تھی البتہ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور بالکل سپاٹ تھا۔ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اس وقت ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میں نواب عارف سعیدی کی بیوہ ہوں۔'' رباطہ نے گفتگو کے سلسلے کی ابتداء کی۔ اتنا کہہ کر اس نے نواب مرحوم سے شادی کی تصاویر، نکاح نامہ، نواب کی وصیت کی نقل اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کردیا۔

دیواس کھنہ ایک ایک کاغذ کو بڑے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے معنی خیز انداز میں اپنا سر ہلا کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''یہ میرا باڈی گارڈ ہے اسلم۔'' رباطہ نے دیواس سے میرا تعارف کرایا۔ ''مجھے اس پر بے حد اعتماد ہے۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔ ''نواب عارف میرا حریف ضرور تھا لیکن اب وہ مرچکا ہے، اس کے ساتھ ہی میری دشمنی بھی ختم ہوئی، بلاشبہ وہ ایک اعلیٰ ظرف انسان تھا۔''

میں اس کی گفتگو سن کر حیران تھا۔ اس کا لہجہ اور گفتگو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ نہ تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے نواب کی موت سے متعلق کوئی سوال نہ کیا تھا۔

رباطہ نے اسے اوڈیسا کمپنی اور اس سے متعلق ساری تفصیل بتادی۔ وہ بڑے انہماک سے تفصیل سنتا رہا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' رباطہ نے بات مکمل کی تو وہ بلا تامل بولا۔

اس کی بات سن کر میں نے اندر ہی اندر اطمینان محسوس کیا۔ رباطہ کا چہرہ بھی مسرت سے کھل اٹھا۔ دیواس سے اتنی جلدی اس بات کی توقع نہ تھی۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اور رباطہ ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

☆......☆......☆

ممبئی سے کالی گاپ آتے ہوئے مجھے ایک جگہ سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے ڈیش بورڈ میں ہاتھ ڈالا تو پتا چلا کہ سگریٹ ختم ہوچکے تھے۔

کار سڑک کے کنارے روک کر میں سگریٹ لینے کے لیے نیچے اتر آیا۔ رباطہ کار میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی، وہ بھی ذرا دیر کو نیچے اتر آئی۔ دیواس کھنہ البتہ کار میں بیٹھا رہا۔ اس نے اترنا پسند نہیں کیا۔ یوں بھی وہ سارے راستے عقبی سیٹ پر نیم دراز ہوکر اونگھتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اور رباطہ کار میں داخل ہوئے تو کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میری نظر پچھلی نشست پر پڑی جہاں دیواس کھنہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا وہ اب سیٹ پر لیٹ گیا تھا، اس کا بھاری اوورکوٹ عقبی نشست پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر کار آگے بڑھادی۔

کافی دور جاکر جب میں نے ایک جگہ تیزی سے بریک لگائے تو جھٹکے سے دیواس کی کیپ سیٹ سے نیچے گری۔ رباطہ نے گھبرا کر پچھلی نشست کی طرف دیکھا اور حیرانی سے بولی۔ ''ارے......ارے......! یہ دیواس کھنہ کہاں چلا گیا؟''

میں نے رباطہ کی متحیرانہ آواز سن کر گاڑی روک دی۔ مڑ کر پیچھے دیکھا، دیواس واقعی اپنی جگہ پر موجود نہ تھا، اس کا کوٹ اور کیپ دونوں پچھلی نشست سے نیچے گرپڑے تھے۔

''بھاگ گیا شاید!'' میں بے اختیار بڑبڑا کر رہ گیا۔

رباطہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ''سوال پیدا ہوتا ہے وہ بھاگا کب اور کیوں؟''

''شاید اس وقت جب ہم دونوں کار سے نیچے ایک ساتھ اترے تھے۔'' میں نے کہا۔

وہ مایوس ہوکر بولی۔ ''اب کیا ہوگا اسلم......؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔

رباطہ بولی۔ ''دیواس کی یوں اچانک گمشدگی میرے لیے حیران کن ہے، ہماری ساری محنت رائیگاں گئی۔''

کار کالی گاپ کی حدود میں داخل ہوئی تو رباطہ نے کہا۔ ''ہوٹل چلنے سے پہلے بینک کی طرف چلنا، میں منیجر سے ملنا چاہتی ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کررہا تھا۔ دیواس کھنہ کو کون اغوا کرسکتا تھا۔ میرا ذہن اس جوڑے کی طرف گیا یعنی ازابیلا اور اسحٰق......! کیونکہ ان کا پہلا شکار دیواس کھنہ ہی تھا۔ دوسرا خیال جو بجلی کی سرعت سے آیا تھا، وہ چندی رام کے بارے میں تھا، اس کا بھی شکار دیواس تھا۔ میرے محتاط اندازے کے تحت ایسی حرکت وہ بھی کرسکتا تھا۔

ذرا دیر بعد میں نے کار رباطہ کے مطلوبہ بینک کے سامنے کھڑی کردی تھی۔

''جب تک تم گھوم پھر آؤ، ایک گھنٹے بعد واپس آجانا۔'' اس نے کہا اور کار سے نیچے اتر کر بینک میں داخل ہوگئی۔

میں کار سے اتر کر سامنے نظر آنے والے ایک ریستوران میں چلا گیا۔ ریستوران میں گھستے ہی میری نظر ازابیلا اور اسحٰق پر پڑی۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں مسکرائے۔

ازابیلا نے پوچھا۔ ''اسلم! کیسے آنا ہوا؟''

''یہ سوال تو خود مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' میں جواباً مسکرایا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اسحٰق میری طرف تکنے لگا۔ مجھے اس روز بیڈن جھیل والا واقعہ یاد آگیا جو ابھی تک میرے اندر عجیب سی بے چینی پیدا کیے ہوئے تھا۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ازابیلا سے پوچھا۔ ''اس روز میں نے تم دونوں کو بیڈن جھیل کے کنارے غوطہ خوری کے لباس میں دیکھا تھا، یہ کیا چکر تھا؟''

میرے سوال پر بیک وقت دونوں کے بشروں پر چونکنے کے آثار نمودار ہوئے اور اسی انداز میں دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے ازابیلا ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد قدرے جھک کر سرگوشی میں بولی۔ ''ہم نے جھیل کی تہہ میں اسلحہ چھپایا تھا۔''

''اسلحہ......! پانی کی تہہ میں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

اس بار اسحٰق بولا۔ ''ہم تم پر بھروسہ کرسکتے ہیں اس لیے بتارہے ہیں، یہاں بہت سخت چیکنگ ہوتی ہے، اسلحہ کچھ زیادہ نہیں، عام استعمال کا چھوٹا موٹا اور حفاظتی ضرورت کا تھا جو واٹر پروف بیگ میں ہوتا ہے۔''

مجھے ان کی باتیں حلق سے اترتی محسوس نہیں ہورہی تھیں۔ وہ دونوں اب بھی مجھ سے کچھ چھپا رہے تھے۔ ان کا ایک مشن واضح ہوچکا تھا جبکہ دوسرا ابھی اندھیرے میں تھا اور جس کا تعلق بیڈن جھیل سے تھا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ میں کافی ختم بھی نہ کرپایا تھا کہ اسی وقت چار آدمی ریستوران میں داخل ہوئے۔ وہ ازابیلا اور اسحٰق کو دیکھ کر مسکرائے پھر الگ الگ میزوں پر جابیٹھے۔ اس کے بعد مزید چار آدمیوں کا دوسرا گروپ آیا۔ وہ سب ایک ہی جیسے لباسوں میں ملبوس تھے اور ان کے کاندھوں پر بڑے بڑے چرمی تھیلے جھولتے نظر آرہے تھے۔

ابھی ذرا ہی دیر گزری تھی کہ ایسا ہی ایک تیسرا دستہ بھی آگیا، وہ بھی الگ میز پر جابیٹھے۔

اپنی وضع قطع سے یہ سب ٹورسٹ نظر آتے تھے مگر جانے کیوں میں ان کی موجودگی میں سنسنی خیز سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔

معاً مجھے سڑک کی دوسری جانب رباطہ بینک سے نکلتی دکھائی دی۔ میں فوراً اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ازابیلا اور اسحٰق کو یہ بتا کر رخصت ہوا کہ میری دوست آگئی ہے جس کے انتظار میں یہاں بیٹھا تھا۔

میں ریستوران سے باہر آگیا۔ رباطہ کی متلاشی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے رباطہ کو کار میں بٹھایا اور اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

کار چلانے کے دوران میرا دل و دماغ ریستوران میں آنے والے دستوں کی طرف چلا گیا۔ وہ وہاں کیوں آئے تھے......؟ میں نے سوچا۔ معاً میرے ذہن میں بجلی کی سی سرعت سے ایک خیال آیا۔ یہ لوگ ضرور ازابیلا اور اسحٰق کے ساتھ ہوں گے اور وہ یقیناً بینک لوٹنا چاہتے ہوں گے جس میں اوڈیسا کمپنی کا سرمایہ اور نواب سعیدی مرحوم کی ذاتی رقوم جمع تھیں۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے کار کی رفتار تیز کردی۔ میں اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

''بینک کے منیجر چندر گپتا سے ملاقات کیسی رہی؟'' راستے میں رباطہ سے میں نے پوچھا۔

''بہت کامیاب اور نتیجہ خیز!'' رباطہ مسکرائی اور اپنے پرس سے کاغذات کا پلندہ نکالتے ہوئے بولی۔ ''یہ اوڈیسا کمپنی کے مکمل شیئرز ہیں اور اب میں ان کی مالک ہوں، میں نے اس خبیث چندی رام کی چال اس پر الٹ دی ہے، اب وہ مجھے دھمکی دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا، اسے کچھ پانے کے لیے میری شرائط پر سمجھوتے کرنا ہوں گے۔''

''مگر تمہیں کیسے مل گئے یہ......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں یہ اڑا لائی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''گویا تم نے یہ چرائے ہیں؟'' میں نے قدرے گھبرا کر کہا۔ ''تمہیں اس جرم میں پندرہ سال کی سزا بھی ہوسکتی ہے۔'' میں نے اسے سنگین نتائج سے آگاہ کیا۔

''مجھے پروا نہیں، دیکھا جائے گا۔'' وہ لاپروائی سے اپنے کندھے اچکا کر بولی۔

میرا وجود بے چینی کا شکار ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ ''مگر یہ تو بتاؤ یہ تمہارے ہاتھ لگے کیسے..؟ آخر یہ حصص رکھے ہوئے کہاں تھے؟''

میرے استفسار پر رباطہ نے اسرار بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی۔

(جاری ہے)

شاطر کھلاڑی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

آخری قسط

''نواب سعیدی کے بینک لاکر میں تھے۔'' بالآخر اس نے بتایا۔ ''منیجر مجھے لاکر روم میں موجود حفاظتی نظام دکھانے کے لیے لے گیا تھا، وہ مجھے یقین دلانا چاہتا تھا کہ لاکر میں جو چاہیں رکھیں، وہ محفوظ رہے گا۔'' مزید بتاتے ہوئے رابطہ مسکرائی تھی۔ میں نے بھنویں اچکائیں تو وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''میرے کہنے پر اس نے نواب کے لاکر کی چابی مجھے دے دی، میں نے اسے کھولا تو حصص کا پیکٹ دکھائی دیا۔ جب منیجر شرارتی موڈ میں مجھ پر جھکا تو میں سارے حصص نکال کر کونے میں ڈال چکی تھی، منیجر میری یہ حرکت نہ دیکھ سکا۔''

''اور پھر تم نے موقع پا کر انہیں نکال کر پرس میں ڈال لیے؟'' میں نے گویا اس کی بات مکمل کی۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب میں دیکھتی ہوں کہ چندی رام مجھے کیسے دھمکی دیتا ہے۔''

''بہرحال ایسا کرنا جرم ہے اور یہ جرم تم سے سرزد ہو چکا ہے۔'' میں نے تشویش ظاہر کی۔ ''کل جب لاکر خالی ملے گا تو منیجر پولیس کو رپورٹ کردے گا اور پھر......!'' میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔

رابطہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر چلائی۔ ''ارے یہ دیکھو یہ کیا ہے......؟'' اس نے کار کی کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

میری نظروں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ یکلخت میرے اعصاب شل ہو گئے اور اسٹیئرنگ پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

سڑک پر ایک شخص اوندھے منہ پڑا ہوا تھا، اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔ میں گاڑی روک کر جلدی سے نیچے اتر آیا اور کار کا انجن چلتا چھوڑ دیا۔

رابطہ بھی میرے ساتھ کار سے نیچے اتر آئی تھی۔

میں زخمی شخص کے قریب جا کھڑا ہوا، وہ مر چکا تھا اور ہر قسم کی امداد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس کا جسم مڑے تڑے انداز میں سڑک پر پڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو بے اختیار میرے حلق سے مارے حیرت کے چیخ نکل گئی۔ ''ارے یہ تو دیواس کھنہ ہے۔''

رابطہ کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی۔ وہ ایک دم نڈھال ہو گئی۔

''کسی نے اسے ہلاک کردیا ہے، جسم کی گرمی بتا رہی ہے کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

''اسلم......! جلدی کرو، یہاں سے نکل چلو فوراً......!'' وہ متوحش لہجے میں میرا بازو تھام کر بولی۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمیں دیکھ لے اور دیواس کا خون ہمارے سر لگ جائے، جس طرح نواب کا قتل تمہارے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

اس کا اندیشہ غلط نہ تھا۔ ہونٹ بھینچے اس وقت میں بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ صورتحال واقعی خطرناک حد تک سنگین ہو گئی تھی اور اگر پولیس ہمیں دھر لیتی تو ہمارے پاس خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہ تھا۔

ہم دونوں کار میں آ بیٹھے۔ میں نے فوراً کار آگے بڑھادی۔ ذرا دیر میں ہی ہم دیواس کی سڑک پر پڑی لاش سے بہت دور جا چکے تھے۔

☆......☆......☆

میں ذہنی طور پر بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ آخر دیواس کو کس نے اور کیوں قتل کیا تھا۔

چندی رام نے یا کسی اور نے......! ابھی میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ ایک مقام پر یکا یک مجھے بریک لگانا پڑے۔ سڑک کے عین درمیان دو کاریں اس طرح ترچھی حالت میں کھڑی تھیں کہ راستہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔

دونوں کاروں کے پاس پولیس کے سپاہی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

پھر ایک نئی الجھن، کوئی نیا ہنگامہ......! شاید ہمارا منتظر تھا۔ میں نے سوچا اور اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔

کار رکتے ہی ایک پولیس انسپکٹر لپک کر ہمارے قریب آ گیا۔

''نیچے اترو......!'' وہ درشت لہجے میں بولا۔

میں اور رابطہ چپ چاپ کار سے اتر آئے۔ ہمارے اترتے ہی رائفل بردار پولیس والوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

پولیس انسپکٹر نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں قانون کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔''

اس دوران ایک آواز اور ابھری۔ ''تم پر قتل کا الزام ہے۔''

یہ چندی رام تھا جو اچانک کسی طرف سے نمودار ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپا کھڑا تھا، اب یکا یک سامنے آ گیا تھا۔

''قتل......؟'' میں گھبرا سا گیا۔ ''کس کا قتل...... میں نے تو کسی کا قتل نہیں کیا؟''

''تم نے دیواس کھنہ کو قتل کیا ہے...... ذرا دیر قبل تم اس کی لاش کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے دیکھ لیا تھا لہٰذا فوراً پولیس کو اطلاع دے دی، پولیس اسی لیے تمہیں گرفتار کرنے آئی ہے۔'' وہ بولتا چلا گیا۔

اور میری حالت غیر ہونے لگی۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے اور رابطہ کو ڈر تھا یعنی دیواس کا قتل بھی میرے سر تھوپنے کی سازش ہو رہی تھی۔

میں نے گھبرا کر رابطہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ وہ چندی رام کو جھکانے کی کوشش میں تھی لیکن چندی رام اس سے زیادہ کائیاں اور ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ دیواس کھنہ کے قتل کا الزام ہمارے سر ڈال کر اس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔

میری نگاہ چندی رام کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بڑی خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ ''انہیں سامنے والے ہٹ میں لے چلو۔''

ہٹ مقفل ہے جناب!'' ایک سپاہی نے اسے بتایا۔

''توڑ دو قفل کو!'' انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا اور ہم دونوں کو ہٹ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

سپاہیوں نے ذرا سی دیر میں ہٹ کا قفل توڑ ڈالا۔ میں اور رابطہ ان کے گھیرے میں ہٹ میں داخل ہوئے۔

چندی رام نے رابطہ کو مخاطب کیا۔ ''تم نے بینک کے لاکر سے جو کاغذات اڑائے ہیں، وہ میرے حوالے کردو۔''

''کیسے کاغذات......؟'' رابطہ ایک دم انجان بن گئی تاہم اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

اوڈیسا کمپنی کے شیئرز کی بات کر رہا ہوں۔'' چندی رام نے غرا کر کہا۔

''میں نے نکالے ہیں اور نہ ہی وہ میرے پاس ہیں۔'' رابطہ نے جواب دیا۔

''تلاشی لو دونوں کی!'' اچانک انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کی طرف مڑتے ہوئے حکم دیا۔

کئی سپاہیوں نے میری اور رابطہ کی تلاشی لی مگر کاغذات ہمارے پاس نہیں تھے۔

چندی رام کا چہرہ پھیکا پڑ گیا، اس پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی پھر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ اس نے انسپکٹر کے کان میں کچھ کہا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اس کی بات سننے کے بعد انسپکٹر سپاہیوں کی طرف مڑ گیا۔ اس کے چہرے پر درشتی پھیل گئی تھی۔

''ان دونوں کو پانچ منٹ دو سوچنے کے لیے...! اس کے بعد پھر بھی اگر یہ نہ بتائیں کہ حصص کہاں چھپا کر رکھے ہیں تو ان کے ساتھ دوسرا طریقہ بلادریغ استعمال کر ڈالو، کوئی رعایت نہ برتنا ان دونوں کے ساتھ!''

رابطہ نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ اس پر کپکپاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ دو تین سپاہیوں نے اپنی پیٹیاں کھول لیں اور انہیں لہراتے ہوئے بگڑے تیوروں کے ساتھ ہماری طرف بڑھے۔

''نہیں...... نہیں! مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' رابطہ ان کے جارحانہ تیوروں پر ایک دم اپنے اوسان خطا کر بیٹھی۔ اس نے بالآخر یہ اگل دیا کہ وہ سارے شیئرز کار کی عقبی سیٹ کے نیچے موجود ہیں۔

چندی رام نے جلدی سے ایک سپاہی کو کار کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ حصص برآمد کر لیے گئے جنہیں دیکھ کر چندی رام کے چہرے پر انتہائی مکروہ قسم کی فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ کامیابی کے جوش تلے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے شیئرز کا پیکٹ اپنے قبضے میں آنے پر ایک لمحے انسپکٹر کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی، اس کے بعد وہ اپنے سپاہیوں سے تحکمانہ بولا۔ ''ان دونوں کو کہیں دور لے جا کر گولیوں سے بھون ڈالو۔''

اس کے سنگدلانہ حکم پر میرے اوسان خطا ہو گئے، میں سمجھ گیا کہ یہ ساری سازش چندی رام کی تھی، وہ ہمیں پولیس والوں کے ہاتھوں ماورائے قانون مروانا چاہتا تھا تاکہ سارے ثبوت مٹ جائیں کیونکہ اوڈیسا کمپنی کے تمام سرمائے کا اب وہ خود مالک بن چکا تھا۔

ادھر جیسے ہی سپاہیوں نے رابطہ کو دبوچ کر گھسیٹا تو وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے چلانے لگی۔ ''نہیں...... نہیں مم...... مجھے مت مارو...... مجھے مت مارو...... میں جینا چاہتی ہوں۔'' اس کی حالت پر مجھے ترس آنے لگا۔ میں نے انسپکٹر کی صرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

معاً میں چونک پڑا۔ میری نظر اس کے شولڈر پر لگے بیج پر جم گئی جو الٹا لگا ہوا تھا۔

ایک لرزہ خیز خیال کے باعث میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ کوئی بھی پولیس انسپکٹر اتنا لاپروا نہیں ہو سکتا تھا کہ سرکاری بیج کو یوں الٹا لگاتا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ پولیس انسپکٹر نہیں تھا بلکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ پولیس کے بھیس میں چندی رام کے کارندے تھے۔ یوں بھی اس کے گولی مارنے کا حکم صادر کرنے پر پہلے ہی ان کی حیثیت میری نظروں کے سامنے مشکوک ہو چکی تھی کیونکہ پولیس بغیر چالان پیش کیے اور مقدمہ عدالت میں چلائے بغیر اس طرح گولی مارنے کی مجاز نہیں ہوتی، اپنی ایک ایک گولی کا حساب بطور ریکارڈ جمع کرانا ہوتا ہے۔

حقیقت سے آشنا ہوتے ہی میرے ٹھٹکے وجود میں جیسے پارہ بھر گیا۔ میں نے سوچا۔ ''اب نہیں تو کبھی نہیں......!''

دوسرے ہی لمحے میں بجلی کی سرعت کے ساتھ اپنی جگہ سے اچھل کر پولیس انسپکٹر کی وردی میں ملبوس اس شخص پر جا پڑا۔ میرے اندر کا ایجنٹ جاگ اٹھا تھا۔

میں نے ایک زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کی۔ اس کے حلق سے ذبح کیے جانے والے جانور کی سی آواز ابھری اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے جا گرا۔

اس کی ناک پچک گئی اور کئی دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ میں نے سرسری نظر سے اسے دیکھا۔ وہ زمین پر پڑا بلبلا رہا تھا۔

میں پھر اپنی جگہ سے اچھلا اور ان سپاہیوں پر جا پڑا جو رابطہ کو گھسیٹتے ہوئے ہٹ سے باہر لے جا رہے تھے۔ میرے ہاتھ اور پاؤں مشینی انداز میں چل پڑے تھے، میرے اندر جیسے پارہ بھر گیا تھا اور میں انسان سے چھلاوہ بن گیا تھا۔

انہوں نے بدحواس ہو کر رابطہ کو چھوڑ دیا اور میری طرف جھپٹے۔ میں نے گھونسے، لاتیں، ہک پنچ اور فلائنگ کک! سارے ہی داؤ ان پر آزما ڈالے بالآخر ایک ایک کر کے وہ سب خاک چاٹنے پر مجبور ہوتے چلے گئے۔ چندی رام کے ساتھی لڑائی کے فن میں یکدم کورے تھے۔

میں نے سب کو ڈھیر کر دیا۔ جب کوئی میرے مقابل نہ رہا تو میں چندی رام کی طرف پلٹا۔ ادھر رابطہ ایک طرف کھڑی خوف سے کپکپا رہی تھی۔

میں نے چندی رام کی طرف چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک اس نے ریوالور نکال لیا۔ میں ٹھٹھک کر جہاں تھا، وہاں رک گیا۔

''خبردار......! کوئی حرکت مت کرنا، ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔'' وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

میں نے اسے ڈرانے کے لیے ذرا جھکائی دی۔ اس نے گولی چلا دی۔ فضا میں دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی رابطہ کی چیخ بھی بلند ہوئی، ساتھ ہی میرے حلق سے بھی مارے اذیت کے کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی تھی۔

چندی رام کے ریوالور کی گولی میرے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور میری آستین لہو سے تربتر ہو گئی تھی مگر میں نے اپنی کوشش ترک نہ کی کیونکہ اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی۔

چندی رام کو دوبارہ گولی چلانے کی مہلت دیئے بغیر میں اس پر جھپٹا اور اسے رگیدتا ہوا ہٹ کے کونے تک لے گیا۔ اب وہ میری گرفت میں تھا۔ خود کو چھڑانے کی جدوجہد میں اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جا پڑا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا گھٹنا رکھ دیا اور اپنی مٹھی میں اس کے بال پکڑ کر اس کا سر زور سے زمین پر مارا۔

چندی رام کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی مگر وہ بلا کا سخت جان ثابت ہوا۔ اس نے یکدم پلٹا کھایا لیکن میں نے دوبارہ اس کی گردن دبوچ لی۔ میری انگلیوں کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد تنگ ہوتا چلا گیا، میں دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

اس کا چہرہ موت کی ہولناکی کے باعث تاریک ہونے لگا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔ وہ رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ ہوا میں لہرانے لگا۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ میرے دوست عارف سعیدی کا قاتل تھا اور اب میری زندگی کے درپے تھا۔ میں اسے کسی صورت زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

پھر اچانک اسے گل کھلانے کا موقع مل گیا۔ اس نے اپنا ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ یکدم میرے زخمی بازو پر رکھ دیا۔ نہ جانے کس طرح اس کمبخت کے تنِ نیم جاں میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے میرے بازو کے زخم پر اپنی انگلیاں گاڑ دیں، ساتھ ہی ایک جھٹکا بھی دیا۔

میں شدید تکلیف سے بلبلا اٹھا، میری چیخیں نکل گئیں اور آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ اس کی گردن پر میرے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

چندی رام نے اس لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھایا، فوراً لوٹ لگائی اور اپنے دونوں پاؤں سکیڑ کر میرے سینے پر جماتے ہوئے مجھے دور اچھال دیا۔ میں خاصی دور جا گرا تھا، میرا زخمی بازو پھٹ گیا تھا، تکلیف کی شدت سے میں پھر چلایا۔

ادھر چندی رام لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ ریوالور پر قبضہ جما چکا تھا۔ وہ ریوالور سنبھالے کسی عفریت کی طرح میری طرف پلٹا۔ اس کا چہرہ وحشت انگیزی کے باعث مسخ ہو چکا تھا۔ میرے چہرے پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ہاتھ آئی بازی غیر متوقع طور پر پلٹ گئی تھی۔

چندی رام ریوالور میری طرف تان کر وحشیانہ انداز میں بولا۔ ''میں اب تمہیں ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا، مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹرائیگر پر اپنی انگلی رکھ دی۔

میں بے بس ہو چکا تھا، ہلنے جلنے کی مجھ میں بالکل سکت نہیں رہی تھی۔ موت بلکہ یقینی موت میرے سامنے ایک دم آن کھڑی ہوئی تھی اور میرے جانی دشمن چندی رام کی حالت زخمی سانپ کی سی ہو رہی تھی۔

اچانک رابطہ چیختی ہوئی اس پر جھپٹی۔ اس میں نہ جانے کس طرح جرأت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے یکلخت چندی رام کا ریوالور والا ہاتھ چھت کی طرف کر دیا۔

چندی رام اوپر تلے گولیاں فائر کرتا چلا گیا۔ کئی دھماکے ہوئے اور ہٹ کی چوبی چھت میں ان گنت روشندان بنتے چلے گئے۔

چندی رام کو شاید ایک طرف ڈری سہمی کھڑی رابطہ سے ایسی جرأت رندانہ کی توقع نہ تھی۔ اس نے جھلا کر ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ رابطہ کے پیٹ پر مکا جڑ دیا۔

اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ خارج ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ شدتِ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

مجھے ایک بار پھر اپنی موت سامنے کھڑی نظر آنے لگی تھی مگر اس بار میں مایوس ہوا، نہ ہمت ہاری۔ میرے لیے اتنا موقع کافی تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ فرش پر لوٹ لگائی اور ماہی بے آب مچھلی کی طرح تڑپتا، لوٹ لگاتا ہوا چندی رام کے قریب جا پہنچا اور میرا وجود بڑی زور سے اس کی ٹانگوں سے ٹکرایا۔

وہ منہ کے بل فرش پر آ رہا، ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ادھر تکلیف سے دہری ہوتی رابطہ کو بھی اپنی پیٹ کی تکلیف بھلانا پڑی۔ وہ تیزی سے فرش پر گرے ریوالور کی طرف لپکی۔ اس اثنا میں چندی رام اپنی شکست کا اندازہ لگا چکا تھا اور شاید اپنی موت کا بھی......! یہی سبب تھا کہ اس نے سردست ''تتلی گلی'' سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ وہ اٹھتے ہی گرتا، پڑتا دروازے کی طرف دوڑا۔

اسی اثناء میں اس کے کوٹ کی جیب سے کوئی شے گری جس کا چندی رام کو بھی احساس ہوا تھا مگر اس وقت اس کے سر پر موت سوار تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر دوڑتا چلا گیا۔

میں نے جھپٹ کر رابطہ سے ریوالور چھینا اور ہٹ کے دروازے پر دو فائر کر ڈالے مگر چندی رام تب تک دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔

اسی وقت میری نظر فرش پر پڑی۔ یہ شیئرز کا پیکٹ تھا۔ میں نے لپک کر انہیں اپنے قبضے میں کر لیا۔ دفعتاً مجھے رابطہ کی کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پیٹ پر پڑنے والی ضرب اس کے لیے زیادہ ہی شدید ثابت ہوئی تھی۔

وہ پیٹ پکڑے جھکی ہوئی تھی، اس کے حلق سے عجیب طرح کی خرخراتی آوازیں نکل رہی تھیں پھر وہ دھڑام سے فرش پر آ رہی۔

میرے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ میں نے اسے اٹھایا اور اپنے کاندھے پر لاد کر قریب کھڑی اپنی کار کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔ اس کے بعد شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں مضطرب رابطہ کا بے سدھ وجود اٹھائے ایک قریبی اسپتال میں جا پہنچا۔ شکر تھا کہ وہاں کا عملہ مستعد تھا، انہوں نے فوراً بے ہوش رابطہ کو طبی امداد دی اور اسے ایک ڈرپ بھی لگا دی۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی اور اب بہتر حالت میں تھی مگر اس کا چہرہ مایوس تھا۔

میں نے اس کے کان میں مسکراتی سرگوشی کی۔ ''بے فکر رہو میڈم! اوڈیسا کمپنی کے حصص ہمارے قبضے میں ہیں۔''

میری بات سنتے ہی یکلخت اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے مجھے ایک نسخہ لکھ کر دیا اور پاس کے اسٹور سے دوائیں لانے کو کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گی؟'' میں نے نسخہ تھامتے ہوئے پوچھا۔

جواباً ڈاکٹر بولا۔ ''کم از کم ایک دن انہیں اسپتال میں رہنا ہوگا۔''

''ویسے کوئی خطرے کی بات تو نہیں...... یہ ٹھیک تو ہیں نا......؟''

''ہاں! ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے لیکن ابھی انہیں بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے، آپ یہ دوائیں لے آئیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

سچی بات یہ تھی کہ مجھے ابھی تک چندی رام اور اس کے غنڈوں کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ یقیناً چندی رام کی طرح زخم کھائے بھیڑیوں کی طرح ہماری تلاش میں ہوں گے جبکہ میں جلد از جلد رابطہ کو لے کر کالی گاپ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کہاں......؟ یہ ابھی خود مجھے بھی معلوم نہ تھا۔

بدبخت چندی رام ذاتی طور پر بھی مجھ سے نمٹنے کی پوزیشن میں تھا اور قانونی طور پر بھی......! جبکہ میرے اور رابطہ کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ تھا، تاہم میرا خیال تھا کہ چندی رام اس معاملے میں پولیس سے مدد لینے کی کوشش نہیں کرے گا، وہ خود ایک بڑا گینگسٹر تھا اور اس کے نزدیک میری بھلا کیا حیثیت تھی، مگر میں نے بھی اب اس کے سامنے ڈٹ جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

میں ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں لے آیا۔ کچھ میرے لیے بھی تھیں۔ یہ کوئی بڑا اسپتال نہ تھا اور نہ مجھ سے میڈیکو لیگل کیس کرانے کا تقاضا کیا جاتا۔ ویسے بھی میں نے انہیں بتایا تھا کہ اٹھائی گیروں سے معمولی جھڑپ [illegible]

تھوڑی دیر بعد میں رابطہ کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی حالت اب کافی بہتر تھی، تاہم نقاہت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

ہم دونوں کے سوا اور وہاں کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر قبل میرے لائے ہوئے انجکشن وغیرہ ایک نرس نے ڈرپ میں ڈال دیئے تھے اور باقی دواؤں کا بتا کر چلی گئی تھی۔

''ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔'' رابطہ نے ہلکی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے سے اندیشہ ٹپکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں! لیکن مجبوری ہے، تمہیں ڈاکٹر ابھی ڈسچارج کرنے کے موڈ میں نہیں ہے، کل صبح تک وہ تمہیں یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔''

''کل صبح تک......؟'' وہ فکرمند سی ہو گئی۔

میں اس کی پریشانی بھانپ کر تشفی آمیز لہجے میں بولا۔ ''فکر مت کرو، یہاں ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''مگر...... وہ...... وہ چندی رام......!'' وہ اس سے بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔

میں نے پھر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے کیا معلوم ہم کہاں ہیں، اسی لیے میں نے اپنی کار بھی ایک طرف کھڑی کی ہے تاکہ باہر آنے جانے اور گزرنے والوں کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔''

''تم یہاں ہی رہنا، کہیں مت جانا۔'' وہ یکدم متوحش لہجے میں بولی۔

''فکر مت کرو، میں یہیں ہوں۔'' میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ ہولے سے دبایا۔

تھوڑی دیر بعد اس پر غنودگی چھانے لگی۔ میں پریشان ہو گیا اور یکدم اٹھ کر اسٹاف روم کی طرف دوڑا مگر نرس نے مجھے بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ڈرپ میں مسکن انجکشن ڈالنے کے باعث ایسا ہوا ہے، اسے نیند اور آرام کی ضرورت ہے۔

مجھے تسلی ہو گئی۔ میں اسپتال سے باہر لان میں ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لی۔ میرا ذہن چندی رام کی طرف متوجہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم کب تک اس سے بچتے پھریں گے۔ بے شک سردست وہ اور اس کے جرائم پیشہ ساتھی اپنے زخم چاٹ رہے ہوں گے مگر وہ نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ ایک بار پھر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اگلی بار پہلے سے زیادہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوں۔

میں رابطہ سے بات کر کے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ وہ گہری نیند میں چلی گئی تھی۔ ویسے مجھے خود بھی اپنے تئیں کوئی لائحہ عمل مرتب کر لینا چاہیے، میں نے سوچا۔ چندی رام آسانی سے ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک اوڈیسا کمپنی کے شیئرز ہمارے پاس ہیں، چندی رام خون آشام عفریت کی طرح ہماری بو سونگھتا پھرے گا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں سب سے پہلے ان کو ٹھکانے لگانا چاہیے۔ ٹھکانے لگانے کے خیال سے بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ کوئی عام کاغذات تو تھے نہیں کہ انہیں کہیں پھینک دیا جاتا۔ میرے سوچنے کا مقصد یہ تھا کہ رابطہ کو یہ حصص فروخت کر دینے چاہئیں۔

میں باہر اسپتال کے لان میں بیٹھا سوچتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ تیسری سگریٹ کے بعد اچانک میرے ذہن میں ازابیلا اور اس کے گروپ کا خیال آیا۔ اگر ان لوگوں سے مدد لی جاتی تو یقیناً......! مگر فوراً ہی میں نے یہ خیال رد کر دیا۔ وہ خود نجانے کس مشن پر تھے، ان کے قریب ہو کر میں ایک نئی مصیبت میں پڑ سکتا تھا۔

ہلکی ہلکی خنک ہوا چلنے لگی تو نیند کے آثار پیدا ہونے لگے۔ میں اٹھ کر اندر آیا۔ مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ وہیں اسپتال کی کینٹین سے فاسٹ فوڈ لے کر پیٹ کی آگ بجھائی اور اسپیشل وارڈ میں آ گیا۔

رابطہ ابھی تک گہری نیند میں تھی۔ موجود نرس نے بتایا کہ یہ صبح تک سوئی رہے گی۔ میں تھوڑی دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ جب نیند زیادہ ستانے لگی تو قریب پڑی آرام دہ سیٹی پر دراز ہو گیا۔ تھکا ہوا تھا، لیٹتے ہی سو گیا۔

رات کے نجانے کون سے پہر میری آنکھ کھلی۔ غیر ارادی طور پر میری نظریں بیڈ پر اٹھ گئیں اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

بیڈ خالی تھا۔ میں تڑپ کر سیٹی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اِدھر اُدھر دیکھا۔ رابطہ کہاں چلی گئی، شاید واش روم میں......! مگر وہ بھی خالی تھا۔ میری تشویش انتہا کو چھونے لگی۔ رات کے دو بجے میں نے اسپتال میں شور مچا دیا۔

سارا عملہ مریضوں سمیت جاگ اٹھا۔ رابطہ کی اس پراسرار گمشدگی پر سب پریشان تھے۔ کچھ کا خیال تھا وہ بھاگ گئی ہے۔ وہ لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان سے بحث کا کیا فائدہ تھا۔

میں نے سارا اسپتال چھان مارا، رابطہ کو پکار پکار کر اسپتال سر پر اٹھا لیا۔ شیئرز میں نے خطرے کے پیش نظر اسپتال میں ہی چھپا رکھے تھے۔ سب سے پہلے میں نے وہ قبضے میں کیے اور دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔

کار میں سوار ہو کر جب میں سنسان سڑک پر نکل آیا تو دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ کار میں میرے علاوہ اور بھی کوئی ہے مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک سرد نال میری گدی سے آن لگی تھی، ساتھ ہی سرسراتی سرگوشی ابھری تھی۔

''چپ چاپ بیٹھے رہو، کار مت روکنا ورنہ گولی تمہاری گردن پھاڑتی ہوئی منہ سے نکل جائے گی۔'' لہجہ اجنبی مگر انتہائی سفاک تھا۔

میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا پھر میں نے سنبھل کر پوچھا۔ ''کون ہو تم......؟''

''میں چندی رام کا آدمی ہوں، ادھر کار موڑ لو۔'' وہ بولا اور ساتھ ہی کار کو بائیں جانب ایک دوسری سڑک پر موڑنے کو کہا۔

''کیا چاہتے ہو...... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے؟''

''اس کا فیصلہ باس چندی رام کرے گا۔''

''کیا اس نے ہی رابطہ کو اغوا کیا ہے؟''

''ایسے کام باس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''آخر تم لوگوں نے رابطہ کو کیوں اغوا کیا ہے؟ ہم تو چندی رام کی چیز (حصص) اس کے حوالے کر چکے تھے۔''

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ غرایا۔ ''ہم تمہاری بھی سوتے میں تلاشی لے چکے ہیں مگر کچھ برآمد نہیں ہوا...... تم نے حصص کہاں چھپائے ہیں، یہ اڈے پر پہنچ کر اب باس کو بتانا۔''

مجھے اس کی بات سن کر ایک جھٹکا لگا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ چندی رام اتنا بیوقوف ہرگز نہ تھا کہ حصص جیب سے گرنے کے بعد وہ سمجھتا کہ وہ کھو گئے ہیں۔ یقیناً اسے اندازہ تھا کہ حصص چونکہ ہٹ میں ہی گرے تھے، اس لیے ان پر دوبارہ قبضہ جمانے والے میں اور رابطہ ہی ہو سکتے تھے۔ وہ جانے کس طرح ہمیں تلاش کرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسپتال پہنچا، میری سوتے میں تلاشی لی۔ حصص برآمد نہ ہونے کے باعث وہ مجھے جھکانے کے لیے رابطہ کو اغوا کر کے لے گئے اور دوسری چالاکی چندی رام نے یہ کی کہ اپنا ایک ساتھی میری کار میں چھپا دیا تاکہ بعد میں، میں رابطہ کو غائب پا کر اس کار میں سوار ہو کر روانہ ہونے لگوں تو مجھے یرغمال بنا لیا جائے۔ حصص اب میرے پاس ہی موجود تھے۔

میرا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ عقبی سیٹ پر موجود ہرکارے نے شاید تاڑ لیا، وہ بولا۔ ''کسی چالاکی کا سوچنا بھی مت کیونکہ اس وقت میرے مزید پانچ عدد مسلح ساتھی ایک دوسری کار میں آ رہے ہیں۔''

میں اس کی بات سن کر ٹھرا اٹھا۔ بیک ویو پر میں نے عقب میں آتی ہوئی ایک دوسری کار کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بدستور ہمارے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ گویا اس کا مطلب تھا کہ میں اور رابطہ ایک بار پھر روح فرسا حالات سے دوچار ہونے والے تھے بلکہ ہو چکے تھے۔ تشویش کی بات یہ نہیں تھی کہ حصص ہاتھ سے جانے والے تھے۔ ان کے جانے سے جان بچ جاتی تو اس سے اچھا سودا اور کیا ہو سکتا تھا مگر خبیث چندی رام تو حصص کے ساتھ ساتھ ہماری جان کے بھی درپے تھا۔ وہ ہمارے خون کا پیاسا تھا۔ رابطہ اس کے قبضے میں جا چکی تھی اور اب میں بھی......!

میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ میرے شوریدہ سر دل و دماغ میں ایک بار پھر وہی گردان ہونے لگی کہ ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ اس وقت میری کار میں چندی رام کا صرف ایک ہی ہرکارہ موجود تھا۔ اس پر میں قابو پانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ رہی بات ان پانچ ہرکاروں کی جو ایک دوسری کار میں تعاقب میں تھے، ان کو جل دیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ ایک تاریک اور نسبتاً تنگ موڑ پر میں نے اسٹیئرنگ کاٹا اور دانستہ ایک جھٹکے سے کار کو بریک لگا دیا۔ رات کے سناٹے میں کار کے ٹائر سمع خراش آواز میں چرچرائے۔ عقبی سیٹ پر موجود میری گردن سے پستول کی نال لگائے بیٹھا ہرکارہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، سیٹ پر لڑھک گیا۔

گدی سے سرد نال کا دباؤ ہٹتے ہی میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپ کر اس پر جھپٹا۔ اس نے سنبھلنے کی ناکام کوشش کے ساتھ غیر ارادی فائر بھی جھونک دیا۔

کار میں گولی چلنے کا سماعت شکن دھماکا ہوا، کار کی چھت میں سوراخ ہو گیا۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کو جھٹکا دیا، ساتھ ہی عقبی سیٹ کے دروازے کو لات رسید کر دی۔ وہ کھل گیا۔

شکر تھا کہ ہرکارہ زیادہ تنومند نہ تھا۔ میں نے بآسانی اسے کار سے باہر دھکا دے دیا اور لپک کر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس دوران ایک اور کار میرے قریب آنے لگی۔ یہ اس کے پانچ ساتھی تھے، وہ کسی بھی وقت مجھ پر فائر کھول سکتے تھے مگر ابھی وہ شاید صورتحال کا اندازہ ہی لگا پا رہے تھے کہ میں نے مخالف سمت کی طرف کار دوڑا دی۔

عقبی سیٹ کا کھلا ہوا دروازہ دوسری کار کے بونٹ سے ٹکرا کر اڑ گیا اور میں گولی کی طرح ان کے قریب سے گزر گیا۔

وہ جب تک موڑ کاٹنے میں مصروف رہے، میں ان سے کافی دور نکل آیا۔ وہ یقیناً میرے تعاقب میں آ سکتے تھے۔ وہ سب مسلح تھے، تعداد میں بھی زیادہ تھے، میں تادیر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے انہیں اپنے تعاقب سے غافل کرنے کی خاطر میں نے شارٹ کٹ اپنایا اور کار جنگل میں اتار دی پھر ایک بڑا چکر کاٹ کر میں دوسری سڑک پر آ گیا اور اسپیڈ بڑھاتا چلا گیا۔

اب یہ کار میرے لیے مشکلات کھڑی کر سکتی تھی، لہٰذا میں نے اسے وہیں کہیں گہرے کھڈ میں اسٹارٹ کر کے دھکیل دیا اور خود پیدل ہی آگے بڑھ گیا۔ ایک قریبی ریستوران میں آ کر بیٹھ گیا، پھر وہاں سے ایک مسافر بس میں بیٹھ کر میں شہر آ گیا۔

میں بے مقصد سڑک گردی کر رہا تھا۔ مجھے مدد کی ضرورت تھی۔ میں اکیلا چندی رام کے قبضے سے رابطہ کو کس طرح چھڑا سکتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ازابیلا اور اس کا ساتھی اسحٰق کا نام میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ اگر میں ان سے اس سلسلے میں مدد طلب کرتا تو......؟ یہ خیال آتے ہی میں نے فوراً ایک ٹیکسی پکڑی اور ان کے ہوٹل جا پہنچا۔

وہ دونوں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس وقت وہاں موجود تھے اور شاید کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے تھے۔ میں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا تو ازابیلا اور اسحٰق کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار نمودار ہو گئے۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ میری مدد کے لیے آمادہ ہو گئے۔

''میں چندی رام کے ٹھکانے سے تو واقف ہوں یا یوں کہہ لیں وہ ایک راستہ ہے چندی رام تک پہنچنے کا!'' تھوڑی دیر بعد اسحٰق نے بتایا۔ اس نے کہا کہ گارڈن اسٹریٹ میں ایک شانتی نام کا کلب ہے، وہ چندی رام کی ملکیت ہے، وہاں سے اس کے ٹھکانے کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دھڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہم سب بری طرح ٹھٹکے۔ ان کا ایک ساتھی حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوا تھا، اس نے بتایا کہ پولیس کو ان پر شبہ ہو گیا ہے اور انہیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

سب کے چہرے فق ہو گئے، خود میں بھی پریشان ہو گیا۔ ان کے ساتھ گرفتار ہونے کا صاف مطلب موت تھا یا پھر طویل عرصے کی اذیت ناک قید......!

''تم فوراً نکل جاؤ۔'' ازابیلا جتنی تیزی کے ساتھ یہ جملہ کہہ سکتی تھی، کہہ گئی۔

میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔ ان سے پہلے میں دروازے کی طرف دوڑا اور طویل راہداری سے ہوتا ہوا ہوٹل کے عقبی گوشے سے باہر آ گیا۔

چندی رام اس ایشو کو استعمال کر کے مجھے قانونی شکنجے میں پھنسا سکتا تھا۔ ازابیلا کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس نے مجھے فی الفور خود سے اور اس کے گروپ سے دور چلے جانے کا کہا تھا۔

میں وہاں سے اسحٰق کے بتائے ہوئے پتے پر شانتی کلب جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اپنے ہوٹل روم پہنچ کر میں نے سب سے پہلے شیئرز ایک خفیہ جگہ چھپا دیئے، تھوڑا حلیہ بدلا اور رابطہ کا دیا ہوا ریوالور چیک کیا اس کے بعد ہوٹل سے نکل کر ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد میں شانتی کلب میں تھا۔ یہاں مجھے جس انداز کی ''شانتی'' نظر آ رہی تھی، وہ مغربی ممالک کے کلب اور پب سے چنداں مختلف نہ تھی۔ موسیقی کا بے ہنگم شور، ملکی غیر ملکی مرد، عورتیں بے ڈھنگے ڈانس اور مے نوشی کر رہے تھے۔ بارٹینڈر کے قریب پہنچ کر میں نے ایک پیگ کا آرڈر دیا۔ یہ ضروری تھا، ورنہ چندی رام کے کسی خفیہ ہرکارے کی نظروں میں مشکوک ہو سکتا تھا۔ پیگ میرے آگے سجا دیا گیا۔

میں نے یونہی اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ میں بظاہر پیگ چہرے کے قریب کرتا پھر سائیڈ میں تھوڑا تھوڑا گراتا جاتا۔ پیگ خالی ہوتے رہنا بھی ضروری تھا۔

یہ کلب دومنزلہ تھا۔ اوپر بھی لوگ آ جا رہے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس کلب کا بیسمنٹ بھی تھا، وہاں شاید بڑے پیمانے پر جوا کھیلا جا رہا تھا۔ میں اسٹول سے اٹھا، پیگ کی قیمت ادا کی، بیسمنٹ کے دروازے پر جا پہنچا۔ معلوم ہوا اندر داخل ہونے کے لیے کوپن کی ضرورت تھی جو میں نے پیسے دے کر حاصل کیا۔

اندر کا ماحول بھی مختلف نہ تھا۔ لوگوں کا شور، سگریٹ کا دھواں، کہیں گالی گلوچ اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دفعتاً میں ایک شخص کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹھکا۔ یہ مجھے شناسا لگا۔ جلد ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ یہ اس جعلی پولیس انسپکٹر کے ساتھیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے مجھے اور رابطہ کو چندی رام کے ایماء پر زدوکوب کیا تھا۔ میں نے اسے ایک واش روم کی طرف جاتے دیکھا تو میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

واش روم خالی تھا، ہلکی روشنی تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اسے شک ہوا کیونکہ بیرونی دروازہ تھا جسے لاک نہیں کیا جاتا۔ اس کے چونکنے کی وجہ یہی تھی۔

اس کا ہاتھ جیب میں رینگ گیا پھر اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آتا، میں تیزی سے اس پر جھپٹا۔ پہلے اس کی جیب سے پستول نکال کر قبضے میں کیا، اس کے بعد اس کا سر لوہے کے پائپ سے ٹکرایا۔ اسے زدوکوب کرنے کے بعد میں نے چندی رام کے بارے میں پوچھا۔ وہ لاعلمی کا اظہار کرنے لگا تو میں نے اس کی پھر ٹھکائی کر دی۔ وہ بری طرح زخمی ہو کر ہانپنے لگا۔

''اب اگر تم نے میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیا تو مجبوراً مجھے تمہیں موت کی نیند سلانا پڑے گا۔'' یہ دھمکی دینے کے بعد میں نے اپنا ریوالور نکال کر اس کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔

چندی رام کے گماشتے اب تک سارے ہی بزدل ثابت ہوئے تھے۔ ابتدا میں خوب گیدڑ بھبکیاں دیتے، جب نرغے میں آتے تو ساری ہوا نکل جاتی۔ میری دھمکی پر وہ فرفر بولنے لگا۔

''چندی رام کدھر ہے اس وقت......؟''

''ادھر ہی ہے۔''

''اسی کلب میں......؟''

''ہاں......!''

''کس طرف کون سے روم میں!''

''بیسمنٹ کی شمالی دیوار کی طرف وہاں ایک سرخ رنگ کا موٹا شنیل کا پردہ پڑا ہے۔''

''آخری سوال......!''

''پوچھو۔''

''وہ ایک عورت کو اغوا کر کے لایا ہے، اسے کہاں رکھا ہے اس نے؟''

میرے اس سوال پر وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے غرا کر اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی پستول کی نال اس کے سینے پر زور سے چبھوئی۔

''ہاں...... ہاں!'' بالآخر اس نے اپنا منہ کھولا۔ ''اسے بھی وہیں رکھا ہوا ہے۔'' اس کے جواب دینے کی دیر تھی کہ میرا پستول والا ہاتھ حرکت میں آیا، اس کا آہنی دستہ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ تیورا کر گرا اور وہیں بیہوش ہو گیا۔ اسے کونے میں پھینک کر میں تیزی سے باہر نکلا۔ تھوڑی دیر بعد میں سرخ پردے والے روم کے سامنے کھڑا تھا۔

وہاں ایک لمبا تڑنگا کالا اور کرخت صورت آدمی کھڑا تھا۔ یقیناً وہ مسلح بھی ہوگا۔ اس نے مجھے اندر جانے سے روک دیا۔ میں نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے باس سے ملنا ہے۔''

''باس اجنبیوں سے نہیں ملتا۔'' کرخت صورت کے ساتھ اس کی آواز بھی کرخت تھی۔

''میں اجنبی ضرور ہوں مگر چندی رام سے میرا غائبانہ تعارف ہے، ایک بگ ڈیل کے لیے ملنا ضروری ہے میرا ورنہ کروڑوں کے نقصان کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔''

وہ سوچ کر بولا۔ ''میں پوچھتا ہوں جا کر۔'' یہ کہہ کر وہ جیسے ہی دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا، میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا اور ساتھ ہی اپنا پستول نکال کر اس کے سر کے پچھلے حصے پر ٹھونک دیا۔ وہ کراہ آمیز چیخ کے ساتھ اندر بچھے قالین پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔'' میں غرایا۔ اندر چندی رام سمیت دو افراد موجود تھے اور رابطہ بھی ایک طرف صوفے پر ڈری سہمی بیٹھی تھی۔

چندی رام مجھے ابتدا میں تو نہ پہچان سکا مگر میری غراتی ہوئی شناسا آواز اس کے لیے اجنبی نہ تھی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے مسخ ہو گیا۔ اس کے دو گرگوں میں سے ایک نے حرکت کرنا چاہی تو میں نے فائر جھونک دیا۔ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ اس کی آہ کی آواز ابھری۔ گولی کھا کر وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا پھر دبیز قالین پر گر گیا۔

دوسرے گرگے نے ہمت نہ دکھائی۔ میں نے اسے ہاتھ کھڑے کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی رابطہ کو پکارا، جواب مجھے پہچان گئی تھی اور اب اس کے سہمے ہوئے متوحش چہرے پر خوشی کی لہر عود کر آئی تھی۔ وہ فوراً میری طرف لپکی۔

''تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے۔'' چندی رام خوفناک غراہٹ سے بولا مگر میں اس کی دھمکی نظرانداز کیے بغیر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ تب میری متلاشی نظروں نے اٹیچ باتھ کا دروازہ تاڑ لیا۔

میں نے دونوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ چندی رام نے اڑی دکھائی، میں نے اس کے ایک بازو کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے بازو میں پیوست ہو گئی۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ برآمد ہوئی۔

''اب کے تمہارے سینے کا نشانہ لوں گا۔'' میں نے غرا کر کہا اور ساتھ ہی اپنے ریوالور کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا۔

دونوں نے اس بار بلاچوں چرا میرے حکم کی تعمیل کی۔ انہیں باتھ روم میں بند کرنے کے بعد میں رابطہ کو لے کر کمرے سے نکلا۔

اندر لوگوں کا رش تھا۔ میں رابطہ کا ہاتھ پکڑے، چھپتا چھپاتا کلب سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد ایک ٹیکسی پکڑی اور اسے اپنے ہوٹل چلنے کو کہا۔ مصلحتاً راستے میں ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی مگر ہوٹل پہنچتے ہی بے اختیار رابطہ مجھ سے لپٹ کر رو پڑی۔ میں تھوڑا گھبرا گیا، پھر پیار سے اس کے ریشمیں گھنے بالوں کو سہلانے لگا۔

وہ جذبات بھرے مگر روہانسے لہجے میں بولی۔ ''اسلم......! میں تمہارے احسانات ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گی، تم نے واقعی اپنے مرحوم دوست کی دوستی کا حق نبھا دیا، ورنہ وہ چندی رام میرا بہت برا حشر کرنے والا تھا۔''

میں اسے دلاسہ دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

تھوڑا آرام سے بیٹھنے کے بعد میں نے روم سروس سے کچھ کھانے پینے کے لیے منگوایا۔ رابطہ کی حالت کافی بہتر تھی۔ میں نے شیئرز اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ جب میں باہر لان تھا تو رات کے کسی پہر چندی رام اپنے دو مسلح گماشتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا، میں نے چیخنے کی کوشش کی تھی کہ اس خبیث نے میری ناک پر رومال رکھ دیا جس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا، دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اس کلب کے کمرے میں پایا، مجھے اغوا کرنے کا مقصد تمہیں بلیک میل کر کے حصص لینا تھے۔''

''میرا خیال ہے اب یہ باب بند ہو گیا ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''مگر اب ہمیں بھارت چھوڑنا پڑے گا ہمیشہ کے لیے، ورنہ چندی رام ہمارے لیے یہ زمین تنگ کردے گا۔''

''میں بھی نہیں رہنا چاہتی یہاں، میں بہت پہلے اس کی منصوبہ بندی کر چکی ہوں اور اس لیے اپنا سب کچھ یہاں سے سمیٹ کر دبئی منتقل ہونے کا انتظام بھی کروا چکی ہوں، میرے دونوں سیکریٹریز یہ کام بخوبی کرلیں گے۔''

''حصص کا کیا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواباً کہا۔ ''دبئی میں کسی طاقت ور اور معتبر کاروباری شخصیت کے ہاتھوں فروخت کردوں گی۔''

میں نے ایک گہری سانس لے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میرا اب اپنا کیا مستقبل تھا......؟ یہ سوچ کر میں اداس ہو گیا تھا، تاہم میرا ارادہ رابطہ کو دبئی چھوڑ کے کسی اور ملک نکل جانے کا تھا۔

سارے مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ ہم ہوائی جہاز کے ذریعے دبئی پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں دو دن رہنے کے بعد میں نے رابطہ کو اپنے آئندہ کے پروگرام سے آگاہ کر دیا تو وہ ایک بڑی دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا مجھ سے بیزار ہو گئے ہو تم......؟''

''نہیں تو......!'' میں نے قدرے گڑبڑا کر کہا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ اب میرا کام اور میرا فرض پورا ہو چکا...... اب تمہاری اپنی زندگی ہے اور میری اپنی......!'' یہ کہتے ہوئے میرے لہجے میں نامعلوم سی اداسی اتر آئی۔

جسے محسوس کر کے رابطہ کے عنابی ہونٹوں پر بھیدوں بھری مسکراہٹ ابھری۔ اس کے بعد اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر جیسے دل کی عمیق گہرائیوں سے بولی۔

''ہم الگ الگ زندگی کیوں گزاریں...... کیا یہ ساتھ ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا......؟''

میں اس کی بات سن کر چونکا پھر بے اختیار اپنا سر جھٹک کر ہنس دیا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ کھڑکی سے باہر طلوع ہوتا سورج ایک نئے دن کا آغاز کر رہا تھا۔

(ختم شد)